تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

جلد03 | شمارہ 2 | ماہ فروری 2018ء

ایڈیٹر

پروفیسر ایس۔اے۔شکور

ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ قومی زبان، صدر دفتر تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی، چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی، حیدرآباد 001 500 تلنگانہ اسٹیٹ۔ انڈیا

Edited, Printed and Published by Prof. S.A. Shukoor,
Owned by Telangana State Urdu Academy, Minorities Welfare Dept., Govt. of Telangana,
Printed at M/s. Taahaa Print Systems, Flat No. 304-B, Door No. 5-9-189, Lenaine Estate, Abids Hyderabad
Published from 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931 **Email:** qaumizaban.tsua2015@gmail.com

ماہنامہ

قومی زبان

مدیر	:	پروفیسر ایس اے شکور، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
ناشر و طابع	:	پروفیسر ایس اے شکور، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
ترتیب و تزئین	:	محمد ارشد مبین زبیری
صورت گری	:	محمد جنید اللہ بیگ
سرورق	:	سید مجیب الدین
طباعت	:	طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، عابڈس، حیدرآباد
ماہ	:	فروری 2018ء
جلد	:	سوم
شمارہ	:	(2)
ترسیلی اختیار	:	تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
استحقاق	:	تمام حقوق تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کی تحویل میں ہیں
مبادلہ ماہانہ	:	15-00 (پندرہ) روپے
مبادلہ سالانہ	:	150-00 (ایک سو پچاس) روپے

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

قرینہ

ہم کلامی	:	پروفیسر ایس اے شکور	6
مضامین:			
جمہوریت کی تعمیر میں علماء کا کردار	:	مفتی امانت علی قاسمی	7
دور آصف جاہی میں حیدرآباد کی گھریلو صنعتیں	:	ڈاکٹر احتشام الدین خرم	13
نامور استاد شاعر فصاحت جنگ جلیل مانک پوری	:	حلیم بابر	20
اُردو سوانح نگاری میں علی گڈھ کا حصہ	:	محمد خوشتر	25
جگر کے عقیدت مندوں میں شکیل بدایونی بھی	:	محمد کیف فرشوری بدایونی	30
غالب کے کلام میں استعارہ کی تصریح	:	نفیس عائشہ	38
دکن میں تراجم قرآن ایک جائزہ	:	سید یوسف صدیق	43
گوشہ خواتین:			
اُردو کی منتخب خواتین قلم کار	:	سعدیہ سلیم	50
خواتین اور صنفی امتیاز	:	راسیہ نعیم ہاشمی	54
مطالعات نسواں۔تعارف، ضرورت واہمیت	:	امان اللہ	59
طنز و مزاح:			
تذکرہ سخنوران دکن (بوم کھنڈراتی)	:	ڈاکٹر محمد علی رفعت آئی اے ایس	64
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟	:	ڈاکٹر محبوب فرید	70
ضدّی	:	حنیف سید	73
حصہ نظم:			
غزلیں	:	انجم شافعی	78
نظمیں	:	محمد انیس فاروقی انیسؔ	79
غزلیں	:	محمد ہارون سیٹھ سلیمؔ	80
غزلیں	:	ڈاکٹر صبیحہ نسرین سمنؔی	81
غزلیں	:	جہانگیر قیاسؔ	82

oOo

ہم کلامی

ماہ فروری 2018ء کا شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔اس شمارے کی ابتداء جناب مفتی امانت علی قاسمی کے مضمون ''جمہوریت کی تعمیر میں علماء کرام کا کردار'' سے کی گئی ہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹر احتشام الدین خرم کا مضمون'' دور آصف جاہی میں حیدرآباد کی صنعتیں''، جناب حلیم بابر کا مضمون'' نامور استاد شاعر فصاحت جنگ جلیل مانک پوری''، اردو سوانح نگاری میں علی گڈھ کا حصہ کے عنوان سے محمد خوشتر کا مضمون' جگر کے عقیدت مندوں میں شکیل بدایونی بھی'' کے عنوان سے جناب محمد کیف فرشوری کا مضمون' غالب کے کلام میں استعارہ کی تصریح کے عنوان سے محترمہ نفیس عائشہ کا مضمون' دکن میں تراجم قرآن''، کے عنوان سے سید یوسف صدیق کا مضمون' گوشہ خواتین میں محترمہ سعدیہ سلیم' محترمہ راسیہ ہاشمی اور جناب امان اللہ کے مضامین' اسی طرح طنز ومزاح میں ڈاکٹر محمد علی رفعت آئی اے ایس کا مضمون'' تذکرہ سخنوران دکن (بوم کھنڈراتی)' ڈاکٹر محبوب فرید کا مضمون'' دل ناداں تجھے کیا ہوا ہے'' اور حنیف سید کا مضمون'' ضدی'' اور آخر میں حسب معمول حصہ نظم میں ممتاز شعراء جناب انجم شافعی' جناب محمد انیس فاروقی انیسؔ' جناب محمد ہارون سیٹھ سلیم' ڈاکٹر صبیحہ نسرین شمسی اور جناب جہانگیر قیاس کے کلام شائع کئے گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ نگارشات وکلام قارئین کے معیار پر پورے اتریں گے اوران کی معلومات ودلچسپیوں میں اضافہ کا باعث بنیں گے۔

تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی اپنے علمی وادبی سفر کے ساتھ ساتھ فروغ اردو کی کوششوں میں ہمہ تن مصروف ہے۔ ان کوششوں میں حکومت تلنگانہ کے احکام کے مطابق اہم سرکاری دفاتر میں اردو مترجمین کے تقرر کے سلسلہ میں جنگی خطوط پر کارروائی جاری ہے اور امید ہے کہ بہت جلد اس اہم کام کی تکمیل ہوجائے گی۔اس کے علاوہ اردو اکیڈیمی کی پچھلے مالیاتی سال کی تقریباً تمام اسکیمات کی تکمیل ہوچکی ہے۔ باقی اسکیمات میں مطبوعات پر انعامات اور مجموعی خدمات پر ایوارڈز کے انتخاب کے لئے بھی کارروائی جاری ہے۔اس دوران میری کوشش رہے گی کہ نئے سال کی اسکیمات کا بھی حسب معمول اپنے وقت پر آغاز ہوجائے۔

ایس اے شکور

پروفیسر ایس اے شکور
ایڈیٹر

مفتی امانت علی قاسمی
استاذ دارالعلوم حیدرآباد

جمہوریت کی تعمیر میں علماء کا کردار

جمہوریت کی خوبی پر اگر بحث کی جائے تو اظہار رائے کی آزادی جمہوریت کی سب سے بڑی خوبی ہے، ایک جمہوری معاشرے میں ہر شخص کو غور وفکر اور بحث و مباحثہ کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ ہر شخص جس خیال کو صحیح سمجھتا ہے بلاخوف واندیشہ اسے بیان کرسکتا ہے، جمہوریت میں مخالف رائے کو بھی اہمیت دی جاتی ہے اور اس طرز عمل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ صحیح نقطۂ نظر کو غالب آنے کا موقع ملتا ہے۔ جمہوریت کی خوبی پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے یوسف صدیق لکھتے ہیں:

جمہوریت عوام کے اخلاق کو بلند کرتی ہے، انہیں انسان دوستی، شرافت، باہمی ایثار اور محبت کے اصول سکھاتی ہے اس لئے اس نظام حکومت کو اخلاقی افادیت کی بنا پر بھی پسند کیا جاتا ہے، جمہوری حکومت میں ملک گیری کی ہوس کم ہو جاتی ہے، حکمرانوں میں جنگوں کا رجحان کم ہو جاتا ہے اور وہ امن پسند ہو جاتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے درست لکھا تھا کہ جمہوریت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ دوسری حکومتوں کے مقابلے میں امن کو زیادہ پسند کرتی ہے (یوسف صدیق، جدید جمہوریت کا تاریخی پس منظر)۔

جمہوریت کے خدوخال اور اس کے ستونوں پر گفتگو کرتے ہوئے عارف عزیز لکھتے ہیں:

''ملک کے ہر شہری کے ساتھ مساویانہ انصاف، ہر باشندے کے ساتھ ریاست کا برابری کا سلوک، تحریر، تقریر، خیال اور اجتماعی سرگرمیوں کی آزادی، تمام فرقوں، مذہبوں اور تہذیبی اکائیوں کو اپنے اپنے دائرے میں پھلنے پھولنے کے مواقع مہیا ہونا یہ مستحکم ستون جن پر ہندوستانی آئین کی شاندار عمارت کھڑی ہے، دنیا کے تمام جمہوری اصولوں کا نچوڑ اور ہندوستانی قوم کی روشن خیالی اور بلند ہمتی کی علامت ہے لیکن اس کا چوتھا ستون اخبارات ہے جن کے ذریعہ رائے عامہ کو باشعور بنانے اور اس کی ذہنی تربیت کرنے کا کام انجام پاتا ہے''۔ (عارف عزیز، جمہوریت کا چوتھا ستون ذرائع ابلاغ ہے، فکروخبر)

جمہوریت کی عناصر پر گفتگو کرتے ہوئے جاوید احمد غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''حاکمیت عوام، مساوات اور انفرادی آزادی جمہوریت کے اجزائے ترکیبی ہیں، انہی عناصر ثلاثہ سے مل کر جمہوریت کا پیکر بنا ہے اگر ان میں ایک عنصر بھی غائب

ہو جائے تو اس سے جمہوریت کا حسن مجروح ہو جائے گا اور اگر تینوں ہی عناصر موجود نہ ہوں تو پھر وہ جمہوریت نہیں آمریت اور ملوکیت ہیؤ'' (جاوید احمد غامدی، اسلام اور جمہوریت،)

جمہوریت کے ستون کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئی عثمان احسن تحریر کرتے ہیں:

''دنیا کے تمام جمہوری ممالک میں جمہوریت کے چار بنیادی ستون مانے جاتے ہیں جن پر جمہوریت کی عمارت کھڑی ہے جمہوریت کے وہ چار بنیادی ستون یہ ہیں:

(۱) مقنّنہ (پارلیمینٹ)' (۲) انتظامیہ (حکومت)'

(۳) عدلیہ' (۴) میڈیا۔

مندرجہ بالا چار ادارے اگر کسی ملک میں کام سرانجام دے رہے ہوں تو یقینی طور اس ملک اور معاشرے کو جمہوری کہا جائے گا (عثمان احسن، جمہوریت کے ستون اول، ہماری ویب)

مذکورہ تحریروں کی روشنی میں دو باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں ایک یہ کہ جمہوریت کے چار ستون ہیں: پارلیمنٹ، انتظامیہ، عدلیہ اور میڈیا، دوسری چیز یہ کہ اظہار رائے کی آزادی، مساوات، انصاف، مذہبی اور تہذیبی آزادی یہ سب درحقیقت انہی ستونوں کے اجزائے ترکیبی ہیں۔اسی لئے ان چیزوں کو جمہوریت کی خوبی اور خصوصیات سے تعبیر کیا جاتا ہے، مثال کے طور پر اظہار رائے کی آزادی میڈیا کا حصہ ہے، انصاف عدلیہ کی ذمہ داری ہے، مساوات مقنّنہ اور پارلیمنٹ کے فرائض میں داخل ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر جمہوریت کے ان چاروں ستونوں کو مضبوط کیا گیا تو اظہار رائے کی آزادی، فکر و خیال اور عقیدہ و ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی، انصاف کا بول بالا ہوگا، ہر شہری اور تمام مذہبی اکائیوں کو اپنے اپنے دائرہ میں پھلنے پھولنے کا موقع میسر ہوگا۔اس لئے میرے خیال سے جمہوریت کی تعمیر و تشکیل اور قوت و استحکام کے لئے جمہوریت کے ستونوں کو مضبوط کرنا ضروری ہے۔

ماضی میں علماء کا کردار تعمیر جمہوریت کے حوالے سے:

علماء کرام یہ قوم کا وہ دانشور طبقہ ہے جنہوں نے ہر زمانے میں اور سنگین سے سنگین حالات میں ملک کی بقاء و سلامتی کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے، غلام ہندوستان میں علماء کرام نے جو جدوجہد کی اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی ہے، انہوں نے اپنے فتوی جہاد کے ذریعہ مسلمانوں میں جہاد آزادی کی روح پھونک دی۔ علمائے کرام صرف فتوی کی تلوار چلا کر گوشہ نشیں نہیں ہو گئے بلکہ میدان کارزار کو گرمایا، انگریزوں کو چیلنج کیا، انہیں لوہے کے چنے چبانے پر مجبور کیا، شاملی اور پانی پت کے علاوہ مختلف جنگوں میں اپنی جانوں کا بیش قیمت تحفہ ملک کے لئے پیش کیا۔

ملک کی آزادی کے وقت تقسیم پاکستان کے نتیجے میں کچھ لوگ ملک کو ہندو راشٹر بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن برادران وطن کی بڑی اکثریت اس بات کی قائل

تھی کہ ملک کا نظام جمہوری ہونا چاہیے اس لئے کہ برطانیہ وغیرہ ممالک میں جمہوریت کا کامیاب تجربات ہو چکے تھے، انگریزوں نے غلام ہندوستان میں بھی جمہوریت کو نافذ کر دیا تھا اور اس نظام حکومت میں ہر شہری کو برابری اور انصاف کا مکمل حق ملتا ہے اس لئے مسلم لیڈران خاص طور پر جمعیۃ علماء جس کے صدر شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی تھے اور مولانا آزاد وغیرہ نے کانگریس کو یاد دلایا کہ آزادی کی جنگ ہندو اور مسلمانوں نے مل کر لڑی ہے اور ہمارا شروع سے مطالبہ رہا ہے کہ جب ملک آزاد ہوگا تو جمہوری اور سیکولر ملک ہوگا اس لئے ملک کا دستور جمہوری ہونا چاہئے۔ ہندو راشٹر کا خواب دیکھنے والے بہت تھوڑے لوگ تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ملک کے لئے کوئی قربانی نہیں دی تھی اور ملک کی غالب اکثریت جمہوریت کی قائل تھی اس لئے ملک کا دستور جمہوری قرار پایا، اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ جمہوریت کی تعمیر میں حضرات علماء کرام کا کردار رہا ہے، گویا اگر کہا جائے کہ جمہوریت کی تعمیر میں علماء کرام کی حیثیت بنیادی پتھر کی ہے جنہیں کسی قیمت پر ملک کی جمہوری کردار سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

ملک کی آزادی کے بعد ڈاکٹر امبیڈکر کی نگرانی میں جو دستور ساز کونسل بنائی گئی تھی اس میں مسلم ارکان بھی شامل تھے جن میں ایک نام بہت مولانا اسمعیل کا ہے جو انڈین یونین مسلم لیگ کے بانی ہیں اور تین مرتبہ کیرالا لوک سبھا سیٹ سے ممبر پارلیمنٹ رہ چکے ہیں۔ انہوں نے دستور سازی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

جمہوریت کا پہلا ستون (پارلیمنٹ):

جمہوریت کے چار ستونوں میں ایک ستون پارلیمنٹ اور مقنّنہ ہے جن کا کام ملک اور شہریوں کے مفاد کے لیے قانون بنانا ہے جو قانون کے مساوات اور برابری کے نقطۂ نظر سے بنائے جاتے ہیں اور اس قانون کا لزوم ہر شہری پر یکساں طور پر ہوتا ہے' اس میں ملک کے کسی شہری کے ساتھ کوئی تفریق نہیں کی جاتی ہے۔ ارکان پارلیمنٹ جس میں لوک سبھا اور راجیہ سبھا دونوں کے ارکان شامل ہوتے ہیں' یہ وہ پہلا ستون ہے جس کے ذریعہ جمہوریت کی تعمیر عمل میں آتی ہے۔ ملک کے جس دانشور طبقہ نے اس میں کردار ادا کیا ہے اس میں علماء کرام بھی شامل ہیں اور لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں علماء کی نمائندگی ہوتی رہی ہے، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا اسعد مدنی، مولانا محمود مدنی، مولانا عبید اللہ خان اعظمی، مولانا بدرالدین اجمل اور مولانا اسرار الحق اور اس طرح کے بہت سے علماء کرام ہیں جو لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ممبر رہے ہیں اس کے علاوہ صوبائی اسمبلی میں بھی علماء کرام نمائندگی کرتے رہے ہیں اور قانون سازی اور جمہوریت کے پہلے ستون کی مضبوط تعمیر میں کردار ادا کیا ہے۔

جمہوریت کا دوسرا ستون (انتظامیہ):

جمہوریت کا دوسرا ستون انتظامیہ ہے، ملک میں جس پارٹی کی اکثریت ہوتی ہے ملک کا نظم ونسق انہی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے، وہی ملک کے سیاہ وسفید کے

مالک ہوتے ہیں اوران کا فرض ہوتا ہے کہ مساوات اور اخوت و بھائی چارگی کی روشنی میں ملک کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرے۔ تمام شہریوں کو یکساں سہولیات فراہم کرے۔ ملک اور ہر شہری کی خوش حالی، ترقی، سہولت اور امن عامہ قائم کرنے کے لئے وسائل استعمال کرے۔ اس جگہ علماء کرام کی خدمات آٹے میں نمک کے برابر ہے، لیکن یہ علماء کرام کی بے توجہی، عدم دلچسپی یا عدم اہلیت کی بنا پر نہیں ہے۔ جو لوگ ممبر آف پارلیمنٹ ہوتے ہیں اور ان کی پارٹی برسر اقتدار ہوتی ہے وہی انتظامیہ میں ہوتے ہیں، اس کے علاوہ حکومت جس کو چاہے وزارت کا عہدہ دے کر ملک کی انتظامیہ میں شامل کرسکتی ہے، جمہوریت کے اس شعبے کو بدقسمتی سے بدنیتی اور تعصب کا گہن لگ گیا ہے اس لئے میں اس شعبہ میں علماء کرام کا کردار نظر نہیں آتا ہے' اگرچہ مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب کی انڈیپنڈٹ پارٹی کی بہار اسمبلی میں کچھ دنوں کے لئے حکومت بنی تھی اس طرح بہار اسمبلی کا نظم ونسق کچھ دنوں کے لئے ان کے ہاتھ میں تھا اور اس طرح کچھ دنوں کے لئے ہی سہی انہوں نے جمہوریت کی میزبانی کا شرف ادا کیا ہے۔

جمہوریت کا تیسرا ستون (عدلیہ):

عدلیہ جمہوریت کا تیسرا بنیادی ستون ہے۔ فاضل جج خواہ ہائی کورٹ کا ہو یا سپریم کورٹ کا پارلیمنٹ کے ذریعہ بنائے گئے قانون اور ڈاکٹر امبیڈکر کے بنائے گئے دستور کو ملک میں نافذ کرنا ہر شہری کے ساتھ یکساں سلوک کرنا اور ہر شہری پر ملک کا قانون نافذ کرنا، جرائم کی روک تھام اور کرپشن اور ملک کے بگڑتے ماحول میں امن و امان قائم کرنے کے لئے مؤثر فیصلے کرنا عدلیہ کی ذمہ داری ہے اور یہی چیز جمہوریت کو مضبوط اور مستحکم کرتی ہے، جمہوریت کے اس ستون میں مجھے علماء کرام کا کردار نظر نہیں آتا ہے۔ علماء کرام کو اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ جمہوریت کو اس جانب سے بھی ہم مضبوط کرسکیں اوران کی خدمت کرسکیں۔

جمہوریت کا چوتھا ستون (میڈیا):

میڈیا جمہوریت کا چوتھا ستون ہے جس میں اظہار رائے کی آزادی، رائے عامہ کو ہموار کرنا، عام آدمی کی رائے سے حکومت اور عوام کو متعارف کرانا شامل ہے، میڈیا جس میں پہلے اخبار آتا تھا اور اب اس میں بہت وسعت ہوگئی ہے الکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا، سوشل میڈیا اور ان سب کی مختلف قسمیں وجود میں آگئی ہیں، جمہوریت کے اس ستون کو دیکھا جائے تو علماء کرام نے اس کی بھرپور خدمت کی ہے اور اس کو مضبوط کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، ابتداء سے ہی علماء نے اس جانب توجہ دی ہے۔ اخبارات ورسائل کی ایک بڑی تعداد ہے جو علماء کرام کے زیر ادارت نکلتا رہا ہے اور اس وقت بھی علماء کرام اس جد وجہد میں لگے ہوئے ہیں اس میدان میں ان کی خدمات کا جائزہ لیں تو فیض احمد فیض کی زبان میں ان کا درد اس طرح نمایاں ہوگا:

ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے
دل پہ جو گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

مستقبل میں تعمیر جمہوریت اور علماء کرام:

بہر حال یہ تو ماضی میں علماء کرام اور تعمیر جمہوریت کا خاکہ تھا جس میں علماء کے کردار کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے آیئے اس پر غور کریں کہ علماء کرام مستقبل میں جمہوریت کی تعمیر کس طرح کر سکتے ہیں اور جمہوریت کی بقاء و تحفظ کے لئے کس طرح اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ علماء کرام سیاست میں حصہ لیں، سیاست کو شریف لوگوں نے گندگی کی آماج گاہ، بدمعاشوں کی بسرگاہ، لچوں لفنگوں کی دانش گاہ خیال کر کے اپنے آپ کو اس سے الگ کر لیا ہے۔ یہ تصور جمہوریت کے لئے بہت خطرناک ہے۔ اگر شریف، ایمان دار، انصاف پسند، سچائی کے علمبردار، انسانیت کے بہی خواہ، ملک سے سچی محبت کرنے والے محبّ وطن سیاست سے اپنا دامن بچالیں گے، اور اس کو اپنے لئے زہر ہلاہل جان کر اس سے دور ہو جائیں گے تو جان لیجئے کہ ملک کا جمہوری نظام خطرے میں پڑ جائے گا، نام تو جمہورت او ردستور کا ہوگا لیکن نظام ڈکٹیٹر شپ سے بھی خطرناک ہوگا، اس لئے اگر ہم جمہوریت کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں ملک او ردستور کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں تو سیاست میں بھرپور حصہ داری ضروری ہے، ہم انتخابی نظام سیاست کو سمجھیں، امیدوار بنیں اور پارلیمنٹ پہنچ کر انصاف اور ترقی پسند قانون بنانے میں اپنا کردار ادا کریں، برسر اقتدار حکومت کا حصہ بن کر انتظامیہ میں شامل ہوں اور انسانیت کی خدمت کو اپنا شیوہ بنائیں، سیاست میں حصہ لے کر ہم جمہوریت کے دو ستون مقنّنہ اور انتظامیہ کو مضبوط کر سکتے ہیں، علماء کرام کا گروہ مختلف رفاہی اور علمی و تحقیقی میدانوں میں نمایاں کام انجام دے رہا ہے لیکن عدلیہ میں ان کی نمائندگی صفر درجہ کی ہے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے اس وقت جب کے مسلم بچوں کی تعلیم پر بہت توجہ دی جارہی ہے اور اس کے لئے کافی جدو جہد ہو رہی ہے، فضلاء مدارس کے مزید تعلمی نظام کو جاری رکھنے اور وسیع تر تعلمی نظام سے انہیں منسلک کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے فضلاء مدارس فراغت کے بعد جس طرح عصری تعلیمی اداروں میں جا کر میڈیکل، انجنیئر نگ، ریسرچ اور مختلف میدانوں میں کام کرتے ہیں اور اپنا کردار ادا کرتے ہیں ایسے فارغ التحصیل طلبہ وکالت کی تعلیم حاصل کریں اور عدلیہ میں اپنا کردار ادا کریں۔ اس کے ذریعہ وہ ملک اور سماج کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں اور خاص کر مظلوموں کو انصاف دلا کر جمہوری نظام کی بہتر تعمیر کر سکتے ہیں۔ ملک کے دانشوروں اور مسلم اداروں کو اس جانب خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہم جمہوری کردار کو عدالت کے ذریعہ بحال کر سکتے ہیں، بچا سکتے ہیں اور مضبوط و مستحکم کر سکتے ہیں۔

چوتھا ستون میڈیا کا ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ ماضی کی طرح اس وقت بھی علماء کرام میڈیا میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں اور میڈیا کی ہر جہت سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔ الکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا، صحافت، اخبارات و رسائل، سوشل میڈیا پر علماء کرام

متحرک نظر آتے ہیں اور اسے مضبوط کرنے کی سعی میں ہیں۔ ہاں ایک خاص جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے، علماء کرام کی زیادہ تر توجہات اردو صحافت پر ہے، علماء کرام کی زیادہ تر تحریریں اردو میں ہی آتی ہیں جب کہ ملک کا ایک بڑا طبقہ اس زبان سے نا آشنا ہے۔ خود مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اُردو نہیں جانتی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ علماء کرام ہندی، انگریزی زبان سے واقفیت حاصل کریں اور ان دو زبانوں میں عبور حاصل کر کے اپنی تخلیقات و نگارشات کو انہی زبانوں میں پیش کریں، انگریزی اخباروں میں آرٹیکل شائع کریں، ہندی اخبارات کی زینت بنیں۔ ہندوستانی قوم سے ان کی زبان میں بات کریں۔ اس سے دو قوموں کے درمیان فاصلے کم ہوں گے۔ اسلام کے اصول دعوت کے پیش نظر بھی ضروری ہے کہ قوموں کی زبان کو سیکھا جائے اور ان کی زبان میں دعوت کا پیغام پہنچایا جائے۔ اس طرح ہم جمہوریت کی بہتر تعمیر کر سکتے ہیں، جمہوریت کو مضبوط کر سکتے ہیں اور ملک کی ترقی و خوش حالی میں اپنا بھی کردار پیش کر سکتے ہیں۔

اخوت و بھائی چارگی اور امن و امان کے قیام میں علماء کا کردار: اخوت و بھائی چارگی، امن و امان کا قیام، قومی یکجہتی پیار و محبت اور احترام انسانیت جمہوریت کی روح ہے، اس کے بغیر جمہوریت کا تصور محال ہے اور یہ وہ خوبی ہے کہ جمہوریت کی حقیقت اسی میں پنہا ہے، ملک کے بعض فرقہ پرست عناصر ملک کے باشندوں کے درمیان موجزن پیار و محبت اور قومی یکجہتی کو کچلنا چاہتے ہیں، لیکن علماء کرام اس سلسلے میں مسلسل کوشش کرتے آ رہے ہیں اور اخوت و بھائی چارگی کو مضبوط کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جماعت اسلامی اور جمعیۃ علماء ہند مسلسل پیام انسانیت کے پروگرام کرتی رہتی ہے، ملک کے نامور عالم دین اور قائد ملت مولانا ارشد مدنی صاحب مسلسل قومی یکجہتی کے پروگرام کرتے رہتے ہیں ان کا کہنا کہ اگر قومی یکجہتی کو فروغ دیا گیا تو ملک کا جمہوری نظام مستحکم ہوگا اگر اس کو نقصان پہنچایا گیا تو ملک تقسیم کے دہانے پر پہنچ جائے گا اس لئے قومی یکجہتی کو فروغ دینا اس وقت سب سے بڑی ضرورت ہے، علماء کرام کو اس جانب بھی خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

رنگ برنگی خوشبودار باتیں

☆ زیادہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔

☆ دوسروں کے آنسوؤں کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے دامن میں جذب کر لینا انسانیت کی معراج ہے۔

☆ نیک بننے کی کوشش کرو جیسے حسین بننے کی کوشش کرتے ہو۔

☆ اعتماد وشیشہ ہے جو ایک بار ٹوٹ جائے تو دوبارہ نہیں بنتا۔

☆ جس طرح سمندر اپنی لہروں کو اپنی حدود میں رکھتا ہے اسی طرح ماں اپنی اولاد کا ہر دُکھ اپنے دل تک محدود رکھتی ہے۔

☆ جو یہ کہے کہ اس کی بات سچی ہے تو اس کی ہر بات جھوٹ ہوگی۔

oOo

ڈاکٹر احتشام الدین خرم
حیدرآباد

دورآصفجاہی میں حیدرآباد کی گھریلو صنعتیں

تاریخی پس منظر: انیسویں صدی کی ابتداء تک حیدرآباد نہ صرف زراعتی بلکہ صنعتی ملک بھی تھا۔ آبادی کا ایک بڑا حصہ گھریلو اور دیہی صنعتوں میں مشغول تھا۔ صنعتی ترقی اور ہنر مندی میں حیدرآباد مغربی ممالک سے بخوبی مقابلہ کرسکتا تھا۔ ریل اور پختہ سڑکوں کے زیادہ نہ ہونے سے بیرونی مال زیادہ مقدار میں نہیں آتا تھا۔ تمام سرکاری دفاتر اور مدارس میں سرکاری ضروریات کے لئے عام طور پر ملک کا بنا ہوا سامان استعمال میں لایا جاتا تھا۔ اہل ملک کا طرز تمدن ایسا تھا کہ یورپ کا بنا ہوا سامان استعمال کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ درباری رسومات میں ملکی پارچہ اور ملکی سامان استعمال کیا جاتا تھا۔

ایک صدی پہلے تک حیدرآباد کے کپڑوں کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اورنگ آباد کا ہمرو، مشروع اور کمخواب، پٹن کی ساڑیاں قورین اور پگڑیاں خاص طور پر مشہور تھیں۔ ۱۶۰۹ء میں جب سفیر ایران، گولکنڈہ کے قطب شاہی دربار میں آیا تو اس کو تحفے کے طور پر ایک نفیس کمخواب کا تھان بھی دیا گیا تھا جس کو پٹن کے کاریگروں نے پانچ سال کی طویل مدت میں تیار کیا تھا۔

ناندیڑ کے سیلے اور ململ اپنی ساخت اور نفاست کے لحاظ سے صنعت گری کے کمال میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان پارچوں کی خوبی یہ تھی کہ ایک ایک تھان چودہ چودہ گز لمبائی کا ہوتا تھا اور ایک انگوٹھی کے حلقے میں سے نکال لیا جاسکتا تھا۔ دکن کے ریشمی کپڑوں کی شہرت ہندوستان کے باہر تک پھیلی ہوئی تھی۔ نارائن پیٹ اور سنگاریڈی کی ریشمی ساڑیاں، سدّی پٹ اور آرمور کے ریشمی پیتمبر، چنور اور مہادیو پور کا ٹسر اپنی اچھائی کی وجہ سے قدیم زمانے سے مشہور ہے۔

قدیم دمشق کی تلواریں جن کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے وہ دکن کے فولاد ہی سے بنائی جاتی تھیں۔ اس فولاد سے تلوار، کٹیتی، بندوق، چاقو، قینچی، اور سروتے تیار ہوا کرتے تھے۔ قدیم دور کی بنی ہوئی بڑی بڑی توپیں جو ریاست حیدرآباد کے قلعوں میں رکھی ہوئی ہیں اب بھی دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کردیتی ہیں۔ بیدری برتن، کریم نگر کا چاندی کی تارکشی کا سامان، دولت آباد کا دستی کاغذ، ورنگل کے قالین، عالم پور کی شطرنجیاں اور مٹ پلی کی کھادی بڑی شہرت کے حامل ہیں۔ کھلونا سازی اور روغن کا کام ایک ترقی پذیر گھریلو صنعت ہے نرمل ضلع عادل آباد اس کے لئے مشہور ہے۔ بعض کام نفیس اور عمدہ ہوتے ہیں اور ان میں جانور، پرند، پھول، پتے اور دیہاتی مناظر ہوتے ہیں۔ یورپ میں صنعتی انقلاب اور برطانوی

حکومت کی آزاد تجارتی پالیسی کی وجہ سے غیر ملک کی مصنوعات کثرت سے دکن میں بھی آنے لگے اس کی وجہ سے اہل ملک کا طرز تمدن بدل گیا۔ اُمرا' جاگیردار' اور دیش مکھ مغربی لباس کو ترجیح دینے لگے۔ مغربی فرش وفرنیچر سے مکانات کو آراستہ کیا جانے لگا۔ سرکاری دفاتر اور مدارس میں صادر کا سامان اور فرنیچر یورپ کا ساختہ خریدا جانے لگا۔ درباری تقریبوں میں انگریزی لباس زیب وتن ہونے لگا۔ غرض ان سب باتوں کا اثر ملکی مصنوعات کے لئے نقصان دینے والا ثابت ہوا اور ان میں زوال شروع ہوگیا۔

۱۹۱۷ء میں حیدرآباد میں ایک جدید محکمہ صنعت و حرفت کا قیام عمل میں آیا تا کہ ملک کو قدیم صنعتوں کی تجدید اور ان کی امداد کی جائے اور وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔ نیز جدید بڑی صنعتوں کے ساتھ گھریلو صنعتوں کو ترقی اور فروغ دیا جائے۔ بہر حال حیدرآباد کی جدید صنعتی زندگی کا سنگِ بنیاد ۱۹۳۹ء میں رکھا گیا جبکہ ایک کروڑ روپے کے سرمائے سے ایک انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ قائم کیا گیا۔ جس سے حیدرآباد کی صنعتی ترقی میں بہت فائدہ ہوا۔ چھوٹی اور بڑی دونوں قسم کی صنعتیں اس سرمائے سے فائدہ اٹھاتی تھیں۔ اس سرمایے کا کچھ حصہ بڑی صنعتوں کے حصص خریدنے میں صرف کیا جاتا تھا اور اس سے جو منافع ملتا اس سے گھریلو صنعتوں کی مالی امداد قرضوں اور امدادی عطیات کے ذریعے سے کی جاتی۔ صنعتی تعلیم حاصل کرنے کے لئے طلباء کو وظائف دیئے جاتے۔ صنعتی نمائشوں اور دوسری ایسی سرگرمیوں میں حصہ لیا جاتا۔

دستی پارچہ بافی: حیدرآباد کی گھریلو صنعتوں میں دستی پارچہ بافی سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس صنعت میں تقریباً دس لاکھ اشخاص کو براہِ راست اور بالواسطہ روزگار مہیا ہوا۔ حیدرآباد کی تقریباً تیس فی صد آبادی کا لباس انہیں کی محنت سے مہیا ہوتا تھا۔ یہ گھریلو صنعت نصف صدی سے زیادہ مدت سے بیرونی کپڑا بنانے والے کارخانوں کے شدید مقابلے کے باوجود ابھی تک زندہ ہے۔ انہیں وجوہ سے دستی پارچہ بافی کی ترقی ہماری خاص توجہ کی محتاج ہے۔ اس میں مشکلات کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ یہاں کے بافندے خام چیزیں بڑھی ہوئی قیمتوں سے خریدتے ہیں اور اپنی تیار کی ہوئی مصنوعات کو سستے داموں فروخت کردیتے ہیں۔ اس کے علاوہ تیاری کے فرسودہ طریقوں' قدیم آلات واوزار' فنی تعلیم کے فقدان اور عام ماحول کی وجہ سے بھی اس گھریلو صنعت میں ترقی کا آثار نہیں پائے جاتے۔

محکمۂ صنعت وحرفت حکومت حیدرآباد کی جانب سے دستی پارچہ بافی کو ترقی دینے کی ممکنہ کوششیں گئیں۔ مندرجہ بالا خامیوں کو دور کرنے کے لئے مختلف اسکیمیں مثلاً دستی پارچہ بافی کی ترقی کی اسکیم' سوت کی کتائی کی اسکیم' بلانکٹ اسکیم' ریشم سازی کی اسکیم' خواتین کے لئے ہوم انڈسٹریز اسکیم' ٹیکسٹائل ڈیزائنگ اسکیم وغیرہ جیسی صنعتیں لگائی گئیں۔ ان نئی اسکیموں کے ذریعہ مزید ترقی کے لئے حسب ذیل مقاصد کو ضروری سمجھا گیا:

(۱) پیشہ وران کے بچوں کو گھریلو صنعتوں کی تعلیم اور انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے ماہروں کی نگرانی میں تربیت دینا۔

(۲) جدید اور ترقی یافتہ آلات کا مظاہرہ۔

(۳) جدید وضع اور نقوش کی مصنوعات کے تیار کرنے میں

مدد دینا۔

(۴) خام اشیاء اور دوسری ضروری متعلقہ اشیاء پیشہ وروں کو فراہم کرنا۔

(۵) تیار ہونے والی چیزوں کی نکاسی کے تدابیر اختیار کرنا اور سہولت بہم پہنچانا۔

اُونی صنعت: اُونی صنعت بھی ریاست حیدرآباد کی ایک اہم گھریلو صنعت ہے جو لاکھوں اشخاص کے روزگار کا ذریعہ بنی۔ یہاں سالانہ تقریباً سات لاکھ کمبل تیار کئے جاتے تھے' ان میں تقریباً دو لاکھ کمبل برآمد کئے جاتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں حکومت حیدرآباد نے ہندستانی افواج کو بلانکٹ فراہم کرنے کے لئے ایک اسکیم منظور کی تھی۔ اس تجربے کے پیش نظر بلانکٹ سازی کی ایک جدید اسکیم منظور کی گئی۔ اضلاع محبوب نگر نظام آباد اور ورنگل میں ان کے مراکز قائم کئے گئے۔ اس اسکیم کا خاص مقصد یہ تھا کہ دستی اونی صنعت کو صحیح اصول پر ترقی اور ان لوگوں کو موثر امداد دی جائے جن کی روزی اسی گھریلو صنعت پر ہے۔ اس اسکیم کے تحت ترقی یافتہ قسم کے چرخوں کو رواج دیا گیا جس سے زیادہ تعداد میں اور بہتر قسم کے کمبل تیار ہوں اور بازار میں جلد اور نفع بخش طور پر فروخت ہوسکیں۔

قالین بافی: قالین بافی حیدرآباد کی ایک مشہور اور قدیم گھریلو صنعت تھی۔ ۱۸۵۱ء میں لندن کی نمائش گاہ میں حیدرآباد کے بعض نادر مصنوعات روانہ کئے گئے تھے' وہاں ورنگل کے قالین خوبی، نفاست اور نقش و نگار کے لحاظ سے بہترین تسلیم کئے گئے لیکن بعد کے زمانے میں اس گھریلو صنعت پر زوال آ گیا اور یہ صنعت قریب الختم ہوگئی تھی۔ ایسے نازک وقت میں محکمہ صنعت و حرفت نے اس کو اپنے ہاتھ میں لیا اور قالین سازی کا ایک آزمائشی کارخانہ قائم کیا گیا۔ اس کارخانے میں اونچے درجے کے معیاری قالینوں سے لے کر اوسط اور معمولی قسم کے سستے قالین تیار ہوتے تھے۔ صناعوں کو خام اشیاء اور رقمی امداد دی جاتی تھی۔ حیدرآباد ہاؤس دہلی کے لئے اعلیٰ قسم کے قالین ورنگل کے اسی فیکٹری میں تیار کئے گئے ہیں۔ دوسری بڑی جنگ کے زمانے میں قالینوں کی مانگ باقی نہ رہی تھی اس لئے یہ کارخانہ حیدرآباد کے ایک بڑے صنعت کار کے حوالے کردیا گیا مگر ترقی نہ کرسکا۔ اس لئے پھر سے محکمہ صنعت و حرفت نے ورنگل کی قالین بافی کو ترقی دینے اور اس صنعت کے معیار کو اونچا کرنے ایک جدید اسکیم تیار کی گئی۔ جس سے صناعوں کی کثیر تعداد کو روزگار فراہم ہوا اور نوجوان کاریگروں کو صنعتی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔

ریشم سازی: ریشم اب کسی خاص طبقے کی زینت کا لوازمہ نہیں رہا ہے بلکہ دنیا کے ہر ترقی یافتہ ملک میں امیر و غریب کی روزمرہ کی احتیاجات میں سے ہوگیا ہے۔ لباس سے کہیں زیادہ طبّی، برقی سائنس اور فوجی ضرویات میں استعمال ہو رہا ہے۔ جس سے مستقبل میں خام ریشم کی بڑی کھپت کا پتہ چلتا ہے۔ کاشت کار بھی اپنے فرصت کے اوقات میں ریشم سازی کو ذیلی پیشے کے طور پر اختیار کرسکتے ہیں۔

حیدرآباد میں ہر سال تقریباً چالیس لاکھ روپے کا ریشم درآمد کیا جاتا تھا۔ یہاں کے حالات صنعت ریشم کے لئے موزوں ہیں۔ ایری سلک اور شہتوت کے ریشم کی صنعت کو رائج

کرنے اور صنعت ٹسر کی تنظیم کے لئے ایک اسکیم پیش کی گئی۔ اس خصوص میں مانیر پراجیکٹ میں ریشم سازی کے کام کا آغاز کردیا گیا ہے۔اس کے علاوہ وہ کاشتکار جو اپنی زمینوں پر شہتوت کی کاشت اور ریشم سازی کو ترقی دینا چاہتے ہیں ان کو محکمہ صنعت و حرفت کی جانب سے فنی و ٹیکنیکل سہولتیں بہم پہنچانے کے اقدامات کئے گئے۔

صنعتِ دباغت و چرم سازی: آصف جاہی سلطنت میں تقریباً پانچ لاکھ اشخاص دباغت اور چرمی اشیاء کی تیاری سے اپنی زندگی کا گزارا کرتے تھے۔لیکن یہ لوگ جدید طریقوں سے ناواقفیت کی وجہ سے زرعی و دیہی ضروریات کے لئے معمولی طریقے پر دباغت کر لیتے جو بہت ہی خراب اور ناپائیدار ہوتی۔ اُس وقت حیدرآباد میں صنعت چرم کی خام اشیاء مثلاً چونا، تیل، مختلف قسم کی چھالیں، چمڑے اور کھال کے وسیع ذرائع موجود تھے اس کے باوجود چمڑے اور کھالیں دباغت کے بعد مدراس کی بندرگاہ سے انگلستان کو روانہ کردئے جاتے تھے۔اس قسم کی برآمد میں ملک کا سخت معاشی نقصان تھا کیونکہ تیار شدہ بوٹ اور شوز اور دوسرا چمڑے کا سامان سالانہ تقریباً پندرہ لاکھ روپے کا درآمد کیا جاتا تھا۔اس کے بجائے مقامی طور پر چرمی سامان مثلاً جوتے، سوٹ کیس اور تھیلیاں وغیرہ تیار کئے جاسکتے تھے۔سرکاری محکمہ جات مثلاً فوج، پولیس اور ریلوے میں ان کی کھپت ہوسکتی تھی۔اس طرح ملک کی دولت باہر جانے سے محفوظ ہوجاتی۔تقریباً تمام یورپی ممالک میں صنعت چرم کافی ترقی یافتہ حالت میں ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں اس صنعت کو پست قوم کی صنعت سمجھ کر اس طرف ایک مدت تک توجہ نہیں دی گئی۔حیدرآباد بھی پہلے اس صنعت کی طرف مائل نہ تھا۔۱۹۳۸ء میں انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کی جانب سے اس صنعت کے چند مراکز قائم کئے گئے۔محکمہ صنعت وحرفت کی جانب سے ایک جدید اسکیم منظور کی گئی ہے جس کے تحت چار مراکز کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ہر مرکز کے تحت بیس طلباء کو چرم سازی کی تربیت دی جاتی تھی۔ دورانِ تعلیم ہر طالب علم کو پندرہ روپے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ان مراکز سے مقامی صناعوں کو خام اشیاء بھی فراہم کی جاتی تھیں۔

صنعت بیدری: بیدری صنعت کا نام اپنے مقام کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔بیدر کی اس گھریلو صنعت کو بہمنی بادشاہوں کے زمانے میں بڑی ترقی نصیب ہوئی اور یورپ تک اس کی قدر ہونے لگی۔ بیدری برتنوں میں جو ڈیزائن استعمال ہوتے ہیں۔وہ مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔ان میں سے زیادہ دلکش خاکے قلعہ بیدر اور اطراف کے گنبدوں کی آرائش و زیبائش سے لئے گئے ہیں۔ ماضی میں اس زمانے کے رواج اور تمدن کے پیش نظر بیدری برتن، حقے، پان کی تھالیاں، اگالدان اور سلفچی وغیرہ تیار کئے جاتے تھے۔لیکن اب محکمہ صنعت وحرفت کی جانب سے صناعوں کو ایسی ہی چیزیں تیار کرنے کے مشورے دئے جاتے ہیں جن کے استعمال کی عام طور پر ضرورت محسوس کی جاتی ہے مثلاً مختلف وضع کے سگریٹ کیس، آئش ٹرے، گلدان، بٹن، ساڑی پن، چوڑیاں، پاندان، اور کاغذ کاٹنے کی چھریاں وغیرہ۔

بیدری اشیاء نہ صرف حیدرآباد اور ہندستان میں مقبول ہیں بلکہ سمندر پار ممالک میں بھی اس کی خاص شہرت

ہے بیدری کام سے ملتا جلتا کام ایک زمانے میں سیالکوٹ اور کشمیر میں بھی ہوتا تھا لیکن جو نفاست اور کاریگری بیدری سامان میں پائی جاتی ہے وہ ان چیزوں کو میسر نہیں۔ یہ ہنر بیدر کے چند خاندانوں میں سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے اس وجہ سے گھریلو صنعتوں میں بیدری صنعت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس وقت بیدر میں اس صنعت کے چار کارخانے ہیں جہاں لاکھوں روپے کا بیدری سامان تیار ہوتا ہے۔

صنعتِ تارکشی: ضلع کریم نگر کی تارکشی کی اشیاء بھی اپنی نوعیت اور ساخت میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ چاندی کے باریک تار تیار کئے جاتے اور پھر ان تاروں سے مختلف قسم کی چیزیں مثلاً پاندان، عطردان، چوڑیاں، ایرنگس ساڑی پن، پوڈر کے ڈبے اور فونٹن پن وغیرہ بنائے جاتے۔ یہ بھی پشتہا پشت سے چلا آرہا ہنر ہے۔ اگرچہ اس سے ملتا جلتا کام کٹک میں بھی ہوتا تھا لیکن اس میں بھدا پن نمایاں ہے۔ جس قدر نزاکت اور نفاست کریم نگر کے تارکشی کے کام میں ہوتی وہ وہاں کے اشیاء میں نہیں ہوتی۔ بیرونی ماہروں نے اس کام کی بے حد تعریف کی۔ بین الاقوامی نمائشوں میں کریم نگر کی اس صنعت کو بے حد پسند کیا گیا۔

کاغذ سازی: جب سلطان محمد بن تغلق نے دہلی کے عوض اپنا پایہ تخت دولت آباد کو قرار دیا تو دہلی کے کاغذ بنانے والے بڑی تعداد میں دولت آباد منتقل ہو گئے اور یہاں کاغذ سازی کی صنعت مستقل بنیادوں پر قائم ہوگئی۔ اس کے بعد کاغذ بنانے والے اپنے طور پر اس صنعت کو ترقی دیتے رہے یہاں تک کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں اس صنعت کو کافی فروغ ہوا۔ ہر قسم کی سرکاری مراسلت اور خط و کتابت کے لئے اسی مقام کا کاغذ استعمال کیا جاتا تھا۔ چھ سات سو گھرانے کاغذ سازی میں مصروف رہتے تھے اور اس کی بدولت خوش حال زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن بیرونی کاغذ کی درآمد کے ساتھ ہی یہاں کی صنعت پر تباہی آ گئی اور پہلی جنگ عظیم سے قبل صرف دو سو کاغذ ساز اس صنعت میں مشغول تھے۔ ۱۹۱۷ء کے شروع میں محکمہ صنعت وحرفت کے قیام کے ساتھ ایک کیمیائی اور صنعتی تجربہ خانہ بھی قائم ہوا۔ اس تجربہ خانہ میں چند طالب علموں کو دستی کاغذ سازی کے متعلق ٹریننگ دی گئی۔ دستی کاغذ کی صنعت سابق ریاست حیدرآباد کے آٹھ مقامات میں جاری تھی۔ اس سے تقریباً دو ہزار پانچ سو اشخاص کو روزگار ملتا تھا۔ ہاتھ سے کاغذ بنانے کی صنعت میں سب سے بڑی رکاوٹ پلپ یعنی گودے کی کمی ہے' کاغذ سازوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو کاغذ بنانے کے لئے ردی کاغذ کو دوبارہ کام میں لاتے ہیں' اس لئے محکمہ صنعت وحرفت نے یہ انتظام کیا تھا کہ موروثی کاغذ سازوں کو سرکاری دفاتر کی ردی بلا قیمت حاصل ہو سکے۔ محکمۂ صنعت و حرفت کی جانب سے دستی کاغذ سازوں کو کیمیائی اشیاء بھی کنٹرول نرخوں پر فراہم کئے جاتے۔ محکمہ اسٹیشنری ڈپو اور محکمہ اسٹور پرچیز بھی دستی کاغذ سازوں کی امداد کی جاتی تھی۔ سرکاری گزٹ کی اشاعت انہیں دستی کاغذوں پر ہوتی۔ شہر حیدرآباد میں دستی کاغذ سازی کی تین چھوٹی فیکٹریاں تھیں۔ یہ کارخانے عید، تہوار اور کرسمس کارڈ، شادیوں کے رقعے رائیٹنگ پیڈ اور جاذب کارڈ بورڈ کے ڈبے خوشنما بناتے

جن کی آج کل بھی بڑی مانگ ہے۔حکومت آصف جاہی نے ملک سے ناخواندگی کو دور کرنے ،تعلیم بالغان اور ابتدائی جبری تعلیم کو نافذ کرنے کی جانب بھی کوششیں کیں اور بہت حدتک اس میں ترقی حاصل کی۔اس وقت ملک میں تعلیم کے پرچار سے کاغذ کی مانگ میں بے حد اضافہ ہو رہا تھا۔کسی ملک کی تہذیب وشائستگی کا اندازہ کاغذ کے صرفے سے ہوسکتا ہے۔مختلف ملکوں میں سالانہ فی شخص کاغذ کے صرفے کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں امریکہ میں ہر سال فی شخص ۱۵۲ر پونڈ کے حساب سے کاغذ صرف ہوتا تھا۔ جرمنی میں یہ مقدار ۴۸ر پونڈ سالانہ فی شخص' جاپان میں ۱۸ ر پونڈ' مصر میں پانچ پونڈ۔جب کہ اُس دور میں ہندوستان میں صرف ایک پونڈ سالانہ فی شخص کاغذ کا صرفہ تھا۔اس سے معلوم ہوگا کہ کاغذ سازی کی صنعت میں اضافے کی کس قدر وسعت اور ترقی کی ضرورت ہے۔

بٹن سازی: دوسری گھریلو صنعتوں کے مقابلے میں بٹن سازی حیدرآباد کی ایک جدید گھریلو صنعت ہے۔اس کی ابتدا ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔بٹن سازی کے کچے مال میں پیتل اور تانبے کے تار، جرمن سلور،سونا، چاندی،لوہے اور فولاد کے تار،انامل ،لاک، سینگ، ہڈی اور دوسرے کیمیائی اشیاء شامل ہیں۔کوٹ' قمیص اور شروانیوں کے بوتام کے علاوہ فوجی تمغہ جات' مانوگرام' انگوٹھی' ایررنگس' چوڑیاں' ساری پن' موٹر کے نمبر پلیٹس اور ڈیروں کے پتلی حلقے وغیرہ خوش نما اور دیدہ زیب تیار کئے جاتے۔جن کی ہندوستان کے باہر بھی بڑی مانگ تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں بٹن سازی کو خوب ترقی ہوئی۔شہر حیدرآباد میں اس صنعت میں کام کرنے والوں کی تعداد ۱۹۴۶ء میں دس ہزار ہوگئی تھی اور تقریباً ایک کروڑ ستر لاکھ روپے کی مالیت کے بٹن تیار ہونے لگے تھے۔ لیکن موجودہ زمانے میں حیدرآباد میں سستے بٹنوں کی درآمد' بیرونی بازاروں کے بند ہوجانے' خام اشیاء کی گرانی اور محصول فروخت وغیرہ عائد ہوجانے کی وجہ سے اس صنعت کو زوال آرہا تھا۔جس کی وجہ سے اس گھریلو صنعت میں کام کرنے والوں کی تعداد پندرہ سو رہ گئی اور سالانہ صرف دس لاکھ روپے مالیت کے بٹن تیار ہو رہے تھے۔

ٹیکسٹائل ٹریننگ سنٹر: گورنمنٹ ٹیکسٹائل ٹریننگ سنٹر جو پہلے گھریلو مصنوعات کے ادارے کے نام سے موسوم تھا ۱۹۳۰ء میں محکمہ صنعت وحرفت کی جانب سے قائم کیا گیا۔ اس وقت سے اس مرکز نے گھریلو صنعتوں کی ترقی میں اہم حصہ لیا ہے۔اس ادارے نے بیس سال کی مدت میں دو ہزار سے زائد طلباء کو ٹریننگ دی جو اپنا روزگار آپ حاصل کرنے کے قابل ہوگئے۔یہاں کاریگروں' پیشہ ور بافندوں اور رنگ سازوں کو بھی اعلیٰ ٹریننگ دی جاتی تھی تاکہ وہ اچھی مہارت حاصل کریں۔

ٹیکسٹائل ٹریننگ سنٹر کا کام حسب ذیل امور پر مشتمل تھا۔(۱) ٹیکنیکل ٹریننگ (۲) مصنوعات کی پیداوار (۳) تحقیقاتی کام (۴) فنی امداد (۵) فراہمی آلات و اوزار اور خام اشیاء۔یہ مرکز اگرچہ صرف پارچہ بافی کے لئے مختص تھے مگر یہاں لاک کا کام' کھلونا سازی' بید بافی

موزن کاری، شطرنجی اور قالین بافی، اونی کام، بلانکٹ سازی اور چرم سازی کا کام بھی سکھایا جاتا تھا۔

بہر حال حکومت آصفیہ میں ٹیکسٹائل ٹریننگ سنٹر صنعتی جدوجہد اور فنی تربیت کے لئے اپنی نوعیت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ مقامی صناعوں اور کاریگروں نے فنی مشوروں اور خام اشیاء کے حصول سے بڑا فائدہ حاصل کیا۔ بیرونی ممتاز مشاہیر نے اس ادارے کے اعلیٰ معیار کی بڑی تعریف کی ہے۔ مختلف نمائشوں میں اس ادارے کے گھریلو مصنوعات نے اپنی صناعی کے کمال کے لئے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔

مصنوعات کی نکاسی: گھریلو صنعتوں کے ترقی نہ کرنے کی ایک اہم وجہ مصنوعات کی نکاسی کا فقدان تھا۔ ہمارے کاریگر اپنے سامان کے لئے کوئی باقاعدہ اور نفع بخش بازار مہیا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے محکمہ صنعت وحرفت نے ۱۹۳۰ء میں فروخت گاہ مصنوعات ملکی کی بنیاد ڈالی۔ اس فروخت گاہ نے بہت سے گھریلو مصنوعات کی نکاسی کا بہترین انتظام کیا۔ جو لوگ اپنا سامان بازار میں فروخت نہیں کر سکتے تھے ان کے لئے یہ سیل ڈپو ایک اچھا خریدار ہونے کے علاوہ بازار میں ان اشیاء کا تعارف اور کھپت کا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہو۔ اس سیل ڈپو سے کاروبار کو مسلسل ترقی ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں سامان کے فروخت کی مقدار صرف ایک ہزار پچیس روپے تھی تو ۱۹۴۸ء میں چار لاکھ اسی ہزار روپے کی مالیت کا سامان فروخت ہوا۔ اس فروخت گاہ نے ہندوستان کی نمائشوں کے علاوہ انگلستان، کینیڈا اور آسٹریلیا کی صنعتی نمائشوں میں حصہ لیا اور حیدرآباد کی مصنوعات نے خراج تحسین حاصل کیا۔ اس سلسلہ میں گھریلو صنعتوں کی کافی تشہیر اور پرچار کیا جاتا تھا۔

ماہ دسمبر ۱۹۴۸ء میں شہر یمتی وجے لکشمی پنڈت سفیر ہندوستان متعینہ امریکہ نے اس ادارے کا معائنہ کیا اور ہماری گھریلو مصنوعات سے بے حد دلچسپی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ حکومت ہند کے توسط سے ان صنعتوں کو بیرون ہند خصوصاً انگلستان اور امریکہ کو روانہ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ اس کے بعد حکومت ہند نے نئی دہلی میں ایک مستقل مرکزی امپوریم قائم کیا۔ جس کے ذریعہ ہندوستان سے باہر بھی ان مصنوعات کی فروخت کا انتظام کیا گیا۔ ہندوستانی سفارت گھروں میں حیدرآباد کے گھریلو صنعتوں کی نمائش کی گئی۔ جس سے بیرونی ملکوں سے مختلف استفسارات وصول ہوئے اور ہماری گھریلو مصنوعات کی بڑی مقدار میں برآمدات کا سلسلہ شروع ہوا۔

اب جب کہ جدید ٹکنالوجی اور جدید مشنریوں کے ذریعہ مصنوعات تیار کی جارہی ہیں تو ایسے میں وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ گھریلو صنعتوں کو مزید مستحکم اور مضبوط بنایا جائے اور ان کو ترقی دی جائے۔ سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ معاشی آزادی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ ہم صنعتی اشیاء کی تیاری اور اپنی ضرورتیں آپ پوری کرنے اور ان چیزوں میں پوری طرح خود مکتفی بننے کے قابل نہ ہو جائیں۔

☆☆☆

حلیم بابر
محبوب نگر

نامور استاد و شاعر حضرت فصاحت جنگ جلیلؔ مانک پوری

ایک جلیل القدر، ممتاز و نامور استاد شاعر کی حیثیت سے حضرت جلیل مانک پوری کا نام بڑی قدر ومنزلت سے لیا جاتا ہے۔ضلع پرتابھ گڑھ یوپی کے قصبہ مانک پور کے متوطن تھے۔حضرت جلیل مانک پوری 1862ء میں پیدا ہوئے۔حضرت جلیل نے کم سنی میں ہی قرآن حفظ کیا۔آپ نے اُردو اور فارسی کی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی۔حضرت جلیل کو بچپن ہی سے شعرگوئی سے بڑی رغبت رہی۔چنانچہ وہ کم عمری میں ہی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے تھے۔

جب جلیل تعلیم کے سلسلہ میں لکھنو روانہ ہوئے تب وہاں پر حضرت امیر مینائی کا ایک بلند مقام تھا۔امیر کی نازک خیالی، معنی آفرینی اور قدرت کلام کی وجہ وہ ایک بلند عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے جانے لگے۔ شروع شروع میں حضرت جلیل نے اپنا کلام بغیر اصلاح مشاعروں میں سنایا کرتے تھے۔ ویسے یہ کلام بھی اس معیار کا ہوتا تھا کہ اس کو اصلاح کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔مگر پھر بھی آپنے حضرت امیر مینائی کے آگے زانوئے ادب طے کیا۔حضرت جلیلؔ کے کلام کو امیر مینائی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے۔حضرت امیر مینائی نے لکھنو میں دفتر امیر اللغات قائم کیا۔جب امیر مینائی کی نظر جوہر شناس اپنے شاگرد حضرت جلیل پر پڑی تو انہوں نے جلیلؔ سے خواہش کی کہ وہ دفتر امیر اللغات سنبھال لیں۔مگر حضرت جلیلؔ کی یہ مجبوری تھی کہ ان کے والد ضعیف تھے اور انہیں چھوڑ کر جانا مشکل تھا۔مگر استاد محترم کے احترام میں حضرت جلیل نے والد بزرگوار سے اجازت حاصل کی اور رام پور روانہ ہوئے۔

والیان رام پور کو شعروسخن کی محفلیں بہت عزیز تھیں۔انہوں نے عالموں سے محفلیں سجائے رکھی تھیں۔ مرزا داغؔ دہلوی اس وقت تک رام پور چھوڑ چکے تھے۔ اس طرح کی ادبی وشعری صحبتوں میں جلیلؔ کے ذوق شاعری نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔حضرت امیر مینائی نے جلیل کے کلام کو بے حد سراہا۔حضرت جلیل کے والد کا انتقال 1897ء میں ہوا۔حضرت امیر مینائی کے شاگردوں میں جلیل حسن کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔آپ کے مرصع کلام کے پیش نظر حضرت نے آپ کو فارغ الاصلاح قرار دیا تھا۔

حضرت جلیلؔ نے بڑی محنت ولگن کے ساتھ امیر اللغات کی اشاعت عمل میں لائی ۔مگر اس کام کی تکمیل میں ہزاروں روپیوں کا قرض ہوگیا ۔اس طرح حضرت امیر مینائی اور جلیلؔ کے پیش نظر کئی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے جس کو نمٹنا بہت مشکل ثابت ہورہا تھا۔ بہرحال حالات کچھ اس طرح سے سنبھلے کہ نواب حامد علی خان وارثی رام پور نے اس کام کی تکمیل میں رقمی تعاون کیا ۔ امیر اللغات کا کام کٹھن مرحلوں سے گزر رہا تھا ۔ ان حالات میں حضرت امیر کی فکر ونظر میں دو مقامات بڑی اہمیت کے حامل تھے ۔ایک بھوپال، دوسرا ریاست حیدرآباد جہاں کچھ امیدواروں کا سلسلہ قائم کیا جاسکتا تھا۔بھوپال میں نواب شاہجہاں بیگم والیہ ریاست تھیں جن کا تخلص تاجورؔ تھا۔وہاں کی محفلوں میں حضرت جلیلؔ شرکت کیا کرتے تھے ۔والی دکن میر محبوب علی خاں آصف جاہ شاعر تھے تخلص آصف کیا کرتے تھے وہ حضرت امیر کی شاعری کے مداح تھے جب 1899 میں شاہ آصف کلکتہ تشریف لے گئے تو حضرت امیر کو اطلاع دی گئی کہ اعلیٰ حضرت کلکتہ سے واپسی پر بنارس میں قیام کریں گے۔

چنانچہ حضرت امیرؔ نے حضرت جلیلؔ کو بھی سفر میں ساتھ رکھا۔استاد شاہ مرزا داغؔ دہلوی بھی آصف جاہ کے ساتھ تھے ۔اس طرح سے حضرت جلیل اور داغ کی پہلی ملاقات بنارس میں ہوئی ۔شاہ آصف نے خواہش کی کہ وہ ان کے ساتھ حیدرآباد چلیں ۔ چنانچہ حضرت امیر مینائی نے حیدرآباد کا ارادہ کیا۔اس طرح اس سفر میں ان کے ہمراہ فرزند لطیف احمد، اختر منیاس، مسعود احمد منیاس، ضمیر منیاس و برادرزادہ لیاقت حسین مینائی اور جلیل بھی تھے ۔حیدرآباد کے قیام کے دوران حضرت امیر علیل ہوگئے ۔اس طرح اس علالت میں وہ ایک ماہ کے اندر انتقال کر گئے ۔ درگاہ یوسفینؒ حیدرآباد میں تدفین عمل میں آئی ۔اس سانحہ کے بعد جلیلؔ پر قیامت جیسی آگئی ۔جلیل کے ہمت واستقلال نے حیدرآباد میں رہنے کو ترجیح دی جبکہ امیر منیاس کے لڑکے اور برادرزادہ نے واپسی کا رادہ کیا اور چلے گئے ۔حضرت جلیل نے محلّہ افضل گنج کرایہ کے مکان میں سکونت اختیار کی ۔حضرت امیر منیاس کے انتقال کے بعد ان کے جانشین بننے کے لئے کئی شاگرد متمنی تھے ۔مگر ان تمام شاگردوں میں حضرت جلیلؔ کا نام سرفہرست تھا۔ بہرحال آپ کی صلاحیتیں اور شعری بلندیوں کے پیش نظر انہیں جانشینی کی سعادت نصیب ہوئی اس زمانہ میں حیدرآباد کی ادبی دنیا وشعری فضا کے خوب چرچے تھے۔

شاہان بیجاپور گولکنڈہ شعروسخن کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ نظام علی خان وارث سلطنت ہونے کے بعد یہاں کے علمی وادبی سرگرمیوں کے بھی وارث کا درجہ رکھتے تھے۔ اس دور کی نمایاں نامور شخصیتیں مولوی چراغ علی، سید حسین بلگرامی، میر مہدی، مولوی نذیر احمد، سید علی بلگرامی، عزیز مرزا اور مشتاق حسین وغیرہ حیدرآباد آچکے تھے اور ان کے فیض سے مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالحلیم شرر، مولوی عبدالحق مولانا حالی مستفید ہورہے تھے ۔مرزا داغؔ دہلوی فصیح الملک کا لقب پاکر استادِ شاہ بن چکے تھے ۔ان کے علاوہ پنڈت رتن ناتھ سرشار، نظم طباطبائی، اصغر دہلوی، بےنظیر وارثی، راز دہلوی، سائل دہلوی، اشک لکھنوی، عبداللہ خاں، ضعیم لکھنوی، نادر علی برتر، نادان دہلوی، درگا پرشاد

ذکا، فروغ لکھنوئی ایوان دکن میں ستاروں کی مانند جگمگا رہے تھے اوراس طرح شعروشاعری بڑی روح پرتھی ۔ان حالات میں جلیلؔ حیدرآباد چھوڑ کر وطن جانا نہیں چاہتے تھے چنانچہ مہاراجہ کشن پرشادؔ نے جلیلؔ کی سرپرستی کی اس طرح جلیلؔ یہیں کے ہورہے۔

ان دنوں حیدرآباد میں مشاعروں کا بہت زور تھا جس میں قابل ذکر درگاہ شمس الدین فیضؔ کے سالانہ مشاعرے ابراہیم خاں تجلی کے مشاعرے، عبد اللہ خاں ضمیم کے مشاعرے، منیر الدین جمعدار کے مشاعرے اورمہاراجہ کشن پرشاد کے مشاعرے ہیں۔دکن کے پہلے مشاعرے میں حضرت جلیلؔ نے شرکت کی جوطرحی تھا۔یہ مشاعرہ حضرت فیض سے معنون تھا ۔ 14 / رجب المرجب 1318ھ مطابق 1900ء کے اس منعقد مشاعرے میں قابل ذکر شعراء نواب آصف الملک کشن پرشاد، رتن ناتھ سرشار، سید کاظم حسین کے علاوہ کئی اورنامور شعراء نے شرکت کی ۔حضرت جلیلؔ کا نام جب رتن ناتھ نے مشاعرہ میں پکارا اور جب جلیلؔ نے غزل شروع کی تو سب ہمہ تن ہوگئے ۔دکن کی سرزمین پر جلیلؔ کی پہلی غزل تھی جس کا مطلع یوں تھا

اب کون پھر کے جائے تیری جلوہ گاہ سے
اے شوخ چشم پھونک دے برق نگاہ سے

اس کے علاوہ غزل کے کئی اشعار اورتحسین مستحق قرار دیئے گئے ۔ میر محبوب علی خاں بادشاہ خود مصرعہ تجویز کرتے تھے۔ اس مشاعرے میں پہلی مرتبہ مرزا داغؔ اور جلیلؔ دونوں شریک تھے جلیلؔ کی غزل نے کافی داد حاصل کی جس کا مطلع حضرت جلیلؔ کی پہچان بنا رہا اس طرح حضرت جلیلؔ کی شاعری کو چار چاند لگ گئے تھے ۔مہاراجہ کشن پرشاد حضرت جلیلؔ سے اصلاح لینے لگے۔

1913ء میں جب ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی ہوئی تو اس میں شرکت کے لئے مہاراجہ کشن پرشاد نے حضرت جلیلؔ کو بھی اپنے ساتھ رکھا۔ دوران سفر حضرت جلیلؔ نے شکر گزاری کے طور پر چند قطعات مہاراجہ کی نذر کئے جو بڑے متاثر کن تھے۔مہاراجہ کشن پرشاد نے محبوب علی خاں والی کودکن کی جشن جوبلی کے موقع پر ایک شاندار مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ وہ مشاعرہ تھا جس میں شاہ دکن نے پہلی مرتبہ جلیلؔ کو دیکھا اورکلام سن کر بے حد خوش ہوئے، اوراعزاز سے نوازا۔ان ہی صلاحیتوں کی بنا جلیلؔ کو ''جلیل القدر'' کے لقب سے نوازا گیا اس کے بعد حالات نے گردش اختیار کی ۔28/ستمبر 1908ء میں موسیٰ ندی میں طغیانی آئی ۔حضرت جلیلؔ اوراختر منیاس نے اپنا گھر چھوڑا اورسدی عنبر بازار تک پہنچے ہی تھے کہ نواب عزیز بہار جنگ اس ہنگامہ میں مل گئے اوراس طرح سیلاب سے بچتے بچاتے جب گھر پہنچے تو سب کچھ سیلاب کے نذر ہو چکا تھا۔ ان حالات میں حضرت جلیلؔ دیوڑھی منتقل ہوگئے ۔مرزا داغؔ دہلوی کے انتقال کے بعدنواب میر محبوب علی خاں نے کسی سے بھی مشورۂ سخن نہیں کیا ۔لیکن بہرحال جلیلؔ کے استادانہ کلام نے شاہ کو بے حد متاثر کیا اور بالآخر شاہ نے حضرت جلیلؔ کو منصب استادی بخشا اورایک فرمان بھی جاری کیا کہ 1910ء استاد جلیلؔ کا پہلا دیوان ''تاریخ سخن'' شائع ہوا۔

اسی دیوان میں وہ تمام غزلیں شامل ہیں جو رام پور

سے لے کر حیدرآباد میں اس کی اشاعت تک لکھی گئی ہیں۔

محبوب علی پاشاہ کے انتقال کے بعد میر عثمان علی خاں عثمان آصف سابع کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے اور شاندار پیمانے پر جشن تخت نشینی کی رسم انجام دی گئی۔ حضرت جلیل کی اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتوں سے میر عثمان علی خاں بھی بے حد متاثر تھے۔ اس تقریب کے بعد جلیلؔ کو اپنے وطن کی یاد آئی۔ چنانچہ آپ نے اجازت حاصل کی اور وطن مانک پور روانہ ہوئے۔

نواب میر عثمان علی خاں نے 1325ء میں اپنی سالگرہ کی تقریب میں جلیلؔ کو ''فصاحت جنگ'' کے خطاب سے نوازا۔ 1938ء میں جلیلؔ حیدرآباد میں بیمار ہوگئے اور دو ماہ کی رخصت لے کر مانک پور روانہ ہوئے۔ علالت سے قبل تک استاد روزانہ دربار رجایا کرتے تھے۔ اس دوران جلیل کی آنکھ میں موتیا بند ہوگیا تھا۔ چنانچہ آپ کی آنکھ کا آپریشن ڈاکٹر ناناجی بنگلور کے ہاسپٹل میں کیا گیا اور بعد صحت وہ حیدرآباد واپس ہوئے۔ شہزادے نواب معظم جاہ شجیع کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ اس خصوص میں 1351ھ میں ایک مشاعرہ شہزادہ شجیع کی صدارت میں منعقد ہوا اور اس مشاعرہ کا آغاز شاہ عثمان کی غزل سے ہوا جس کا مقطع یوں ہے:

مصیبت ٹل نہیں سکتی جو ہوتا ہے وہی ہوگا
دکن کا میرؔا ے عثمان خدا خود ہی نگہباں ہو

اس طرح کے مشاعروں میں شرکت سے جلیلؔ کی توقیر میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور ہر مشاعرہ میں جلیل کے کلام کی بے پناہ ستائش ہوتی رہی۔ جلیلؔ کے آخری ایام علالت میں گزرے۔ ضعف دماغ اور رعشہ کی شکایت ہوگئی۔ اس دوران آصف سابع نے علاج و معالجہ میں بڑی دلچسپی لی۔ اور قابل ڈاکٹروں سے علاج کروایا۔ کبھی غشی طاری ہوتی، کبھی ہوش آتا۔ جب ہوش میں ہوتے تو قرآنی آیت کی تلاوت کرتے تھے۔ انتقال سے پہلے ہوش و حواس اچھے ہوگئے تھے۔ آخر کار اس کیفیت کے ساتھ جلیلؔ یکم صفر 1365ھ مطابق 6/جنوری 1946ء رات 9 بجے شب دوشنبہ انتقال کر گئے۔ تدفین و نماز جنازہ میں شاہ عثمان نے خود شرکت کی اور ارشاد فرمایا کہ ''ایک شخص اٹھ گیا'' وہ نہ صرف شعر و سخن کی دنیا میں کامل تھا بلکہ زہد و تقویٰ میں بھی بے مثال تھے۔ میں نے جلیل صاحب سے ربع صدی سے زیادہ استفادہ حاصل کیا ہے۔ امام الفن دنیا سے رخصت ہوگیا۔''

حضرت جلیل نے زندگی میں دو شادیاں کیں۔ پہلی زوجہ سے پانچ اولاد ہوئیں۔ جن میں صدیق احمد اثرؔ، نہال احمد، انیس احمد، کلیم، سلیم، یونس احمد تھے۔ دوسری زوجہ سے چار لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکوں میں عزیز احمد جلیلی، علی احمد جلیلی، نثار احمد مشتاق جلیلی نے دنیائے علم و ادب میں بہت نام کمایا۔ جلیل کے تین شاعری کے مجموعے تاج سخن، جان سخن اور روح سخن ہیں جن کے تمام اشعار دلوں کو چھو لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ جلیل نے سوانح امیر مینائی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو ماہرین عروض کی نظر میں ایک شاہکار سے کم نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ جلیل کے نعتیہ شاعری بڑی تقدس و احترام کی حامل ہے۔ اشعار کے مطالعہ سے ایمان حرارت کو جلا ملتی ہے

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نعت گوئی پہ مری سب کو گماں ہے کہ جلیلؔ
فیض ہے اس میں امیرؔ الشعراء سے مجھکو

ooo

لب پہ جس دم مرے نام شہ بطحا آیا
عمر رفتہ پلٹ آیا کہ مسیحا آیا
صرف حب نبوی حشر میں کام آئی جلیلؔ
طاقتیں آئی نہ زہد آیا نہ تقویٰ آیا

ooo

صبا کیا کھلائے گی دل کی کلی
تمہاری گلی کی ہوا چاہیے

غزل کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جلیلؔ آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

ooo

جب میں چلوں تو سایہ بھی میرا نہ ساتھ دے
جب تم چلو تو زمیں چلے آسماں چلے

ooo

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

ooo

اچھے تم آئے دیکھنے مریض کو
آنکھیں دکھا کے اور بھی بیمار کر دیا

☆☆☆

والدہ کی فرماں برداری کا عجیب واقعہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا یا اللہ! میرا جنت کا ساتھی کون ہے؟ اللہ نے فرمایا کہ فلاں قصائی۔ قصائی کا پتہ بتایا۔ نہ کسی ابدال کا نہ کسی قطب کا' نہ کسی شہید کا نہ محدث کا۔ کہا کہ فلاں قصائی! حضرت موسیٰؑ حیران ہوگئے۔ پھر اس قصائی کو دیکھنے چلے گئے۔ قصائی بازار میں بیٹھا گوشت بیچ رہا ہے۔ شام ڈھلی' اس نے دکان بند کی اور گوشت کا ٹکڑا تھیلے میں ڈالا اور گھر چل دیا۔ موسیٰؑ بھی ساتھ ہوگئے۔ کہنے لگے بھائی تیرے ساتھ جاؤں گا۔ اس کو نہیں پتہ تھا کہ یہ موسیٰؑ ہیں۔ کہنے لگا آجاؤ۔ گھر گئے۔ اس نے بوٹیاں بنا کر سالن چڑھایا' آٹا گوندھا' روٹی پکائی' سالن تیار کیا۔ پھر ایک بڑھیا تھی' اسے اُٹھا کر کندھے کا سہارا دیا۔ سیدھے ہاتھ سے لقمے بنا بنا کر اُسے کھلائے۔ اس کا منہ صاف کیا' اس کو لِٹایا۔ وہ کچھ بولی' بڑبڑائی۔ موسیٰؑ نے پوچھا یہ کون ہے؟ اس نے کہا میری ماں ہے۔ صبح کو اس کی ساری خدمت کر کے جاتا ہوں اور رات کو آکر پہلے اس کی خدمت کرتا ہوں۔ اب اپنے بچوں کو دیکھوں گا۔ موسیٰؑ نے فرمایا۔ یہ کچھ کہہ رہی تھی؟ کہا ہاں جی! روز کہتی ہے۔ عجیب بات ہے۔ میں روز اس کی خدمت کرتا ہوں تو کہتی ہے کہ اللہ تجھے موسیٰؑ کا ساتھی بنائے۔ میں قصائی۔ میں کہاں اور موسیٰ علیہ السلام کہاں؟۔

دیکھا آپ نے یہ ہوتی ہے ماں کی خدمت۔ اس کا صلہ کیا ملا۔ اللہ نے ماں کی خدمت کے عوض ایک قصائی کو موسیٰ علیہ السلام کی معیت دیدی۔

oOo

محمد خوشتر
ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد
گچی باؤلی، حیدرآباد

اُردو سوانح نگاری میں علی گڑھ تحریک کا حصہ

مسلمانوں کی تعلیمی ، معاشی، اقتصادی، سیاسی اصلاح وترقی کے لئے جو تحریکیں معرض وجود میں آئیں ان میں ایک اہم تحریک علی گڑھ تحریک یا سرسید تحریک بھی ہے۔ جو مسلمانوں کی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں، گوشوں اور پہلوؤں پر محیط واثر انداز ہوئیں اور اس کی بدولت مختلف شعبہائے حیات میں انقلاب بھی پیدا ہوا۔ خاص طور پر سماجی اور ادبی میدان میں اس کی سب سے زیادہ نمایاں خدمات ہیں۔ علی گڑھ تحریک کی سماجی وادبی خدمات کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے، ان کی وجہ سے غور وفکر ، تدبر وتفکر، تہذیب وتمدن، کلچر وثقافت اور طرز معاشرت، طرز رہائش، طرز نگارش، آرائش وزیبائش، ادب و شاعری سبھی میں انقلاب پیدا ہوا جس کا اس تحریک سے پہلے تصور بھی مشکل تھا۔ 1857ء کی ناکامی نے سرسید جیسے عظیم مصلح ومفکر کو بھی دور اندیشی اور مصلحت پسندی کے لئے مجبور کر دیا چنانچہ وہ اسی نتیجہ پر پہنچے کہ اب تصادم وٹکراؤ کا راستہ چھوڑ کر خود کو تعلیم وتعلم میں مشغول کر لینا چاہئے، کیونکہ اب حالات میں تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ علی گڑھ تحریک کی بدولت سماج میں تعلیم و تدریس کا ذوق یقینی طور پر عام ہوا اور اس کو بڑا فروغ حاصل ہوا، اسی تحریک کا کارنامہ ہے جو انگریزی تعلیم کا حصول مسلمانوں میں عام ہوا۔ غرض ہماری سماجی، سیاسی، علمی اور عملی زندگی میں علی گڑھ تحریک کے دیرپا نقوش ثبت ہوئے خود علی گڑھ تحریک کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے۔

دنیا میں آج تک جو کچھ کہا گیا یا لکھا گیا وہ کہنے، لکھنے، اور پڑھنے والوں نے یا تو اپنے بارے میں کہا اور لکھا یا پھر اس کائنات کے بارے میں جو اس کے اردگرد پھیلی ہوئی ہے۔ پہلی شکل میں یہ آپ بیتی ہوئی اور دوسری شکل میں جگ بیتی۔ آپ بیتی اور جگ بیتی سوانح ہی کے دو روپ ہیں۔ آپ بیتی خود نوشت سوانح اور جگ بیتی سوانح ہے، آیئے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ سوانح ہے کیا۔ سوانح عمری کے متعلق قاضی مشتاق احمد صاحب اپنی کتاب اردو نثر کا مطالعہ میں تحریر کرتے ہیں، کارلائل کے نزدیک ''سوانح عمری ایک انسان کی حیات ہے''۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سوانح عمری ایک انسان کی تاریخ ہے۔ اینڈ منڈ گاس کہتا ہے کہ ''سوانح عمری کی انسانی روح کی مہمات حیات کی ہو بہو تصویر ہے''۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق، سوانح عمری وہ بیانیہ تحریر ہے جس میں کسی فرد کا اعمال نامہ مرتب کرنے اور اس کی شخصیت کی بازآفرینی کی شعوری اور فنکارانہ کوشش کی جائے۔ تاریخ کے برعکس اس کا موضوع فرد ہے اور تخلیقی ادب کے برعکس یہ ایک ایسی زندگی کی داستان ہے جو حقیقتاً بسر کی گئی ہو۔ سوانح نگار جہاں مورخ کی

طرح صداقت کا خیال رکھتا ہے وہاں ناول نگار کی طرح ایک پارۂ فن کی تخلیق بھی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی عظیم سوانح عمریاں وہی ہیں جن میں موضوع ہو بہو ویسا ہی پیش کیا گیا ہو جیسا کہ وہ ہے البتہ ان کی حقائق کا انبار نہیں لگایا جاتا بلکہ واقعات کے تانے بانے سے ایک جیتی جاگتی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ سوانح عمری کی دلچسپی سدا بہار ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ یہ کسی مشہور، نمایاں یا دلچسپ شخصیت کے بارے میں ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ تر اس بنا پر کہ اس کا موضوع فطرتِ انسانی ہے۔ چنانچہ سوانح عمری بطور فن بجا طور پر کسی بھی فرد سے متعلق ہوسکتی ہے چاہے کتنا ہی کمتر ہو۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ انسانی جذبات اور بشری محرکات کے دل میں کھب جانے والے تجزیے کا ذریعہ ہے۔ (ص25)

نیز اسی کتاب میں ایک جگہ سیرت کے تعلق سے بھی کچھ بحث کی گئی ہے جو معلومات میں اضافہ کا سبب بن سکتی ہے لہٰذا ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے ''جامع اللغات میں سیرت کا مطلب سوانح عمری، فیروز اللغات علم تاریخ اور نسیم اللغات میں ذاتی جوہر بیان کیا گیا ہے۔ سیرت کا لغوی مفہوم اگرچہ کسی نیک سرشت انسانوں کا انفرادی کردار، مزاج، زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ اور اس کی سوانح عمری ہے۔ لیکن بنیادی طور پر اس سے حضورﷺ کے حالات زندگی اور ان کے اخلاق و عادات کا بیان ہی مراد لیا جاتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ کئی صدیوں تک یہی طریقہ رہا۔ چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں مثلاً سیرت ابن حشام، سیرت اموی وغیرہ۔ ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں البتہ زمانہ مابعد میں مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں۔ مثلاً مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔

مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی، اقتصادی، سیاسی اصلاح و ترقی کے لئے جو تحریکیں معرض وجود میں آئیں ان میں ایک اہم تحریک علی گڑھ تحریک یا سرسید تحریک بھی ہے۔ جو مسلمانوں کی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں، گوشوں اور پہلوؤں پر محیط واثر انداز ہوئیں اور اس کی بدولت مختلف شعبہائے حیات میں انقلاب بھی پیدا ہوا۔ خاص طور پر سماجی اور ادبی میدان میں اس کی سب سے زیادہ نمایاں خدمات ہیں۔ علی گڑھ تحریک کی سماجی و ادبی خدمات کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے، ان کی وجہ سے غور و فکر، تدبر و تفکر، تہذیب و تمدن، کلچر و ثقافت اور طرز معاشرت، طرز رہائش، طرز نگارش، آرائش و زیبائش، ادب و شاعری سبھی میں انقلاب پیدا ہوا جس کا اس تحریک سے پہلے تصور بھی مشکل تھا۔ 1857ء کی ناکامی نے سرسید جیسے عظیم مصلح و مفکر کو بھی دور اندیشی اور مصلحت پسندی کے لئے مجبور کر دیا چنانچہ وہ اسی نتیجہ پر پہنچے کہ اب تصادم و ٹکراؤ کا راستہ چھوڑ کر خود کو تعلیم و تعلم میں مشغول کر لینا چاہئے، کیونکہ اب حالات میں تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ علی گڑھ تحریک کی بدولت سماج میں تعلیم و تدریس کا ذوق یقینی طور پر عام ہوا اور اس کو بڑا فروغ حاصل ہوا، اسی تحریک کا کارنامہ ہے جو انگریزی تعلیم کا حصول مسلمانوں میں عام ہوا۔ غرض ہماری سماجی، سیاسی، علمی اور عملی زندگی میں علی گڑھ تحریک کے دیرپا نقوش ثبت ہوئے۔ خود علی گڑھ تحریک کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے۔

دنیا میں آج تک جو کچھ کہا گیا یا لکھا گیا وہ کہنے،

لکھنے، اور پڑھنے والوں نے یا تو اپنے بارے میں کہا اور لکھا یا پھر اس کائنات کے بارے میں جو اس کے اردگرد پھیلی ہوئی ہے۔ پہلی شکل میں یہ آپ بیتی ہوئی اور دوسری شکل میں جگ بیتی۔ آپ بیتی اور جگ بیتی سوانح ہی کے دو روپ ہیں۔ آپ بیتی خود نوشت سوانح اور جگ بیتی سوانح ہے، آیئے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ سوانح ہے کیا۔ سوانح عمری کے متعلق قاضی مشتاق احمد صاحب اپنی کتاب اردو نثر کا مطالعہ میں تحریر کرتے ہیں، کارلائل کے نزدیک ''سوانح عمری ایک انسان کی حیات ہے''۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سوانح عمری ایک انسان کی تاریخ ہے۔ ایڈمنڈ گاس کہتا ہے کہ ''سوانح عمری کی انسانی روح کی مہمات حیات کی ہو بہو تصویر ہے''۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق، سوانح عمری وہ بیانیہ تحریر ہے جس میں کسی فرد کا اعمال نامہ مرتب کرنے اور اس کی شخصیت کی بازآفرینی کی شعوری اور فنکارانہ کوشش کی جائے۔ تاریخ کے برعکس اس کا موضوع فرد ہے اور تخلیقی ادب کے برعکس یہ ایک ایسی زندگی کی داستان ہے جو حقیقتاً بسر کی گئی ہو۔ سوانح نگار جہاں مورخ کی طرح صداقت کا خیال رکھتا ہے وہاں ناول نگار کی طرح ایک پارۂ فن کی تخلیق بھی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی عظیم سوانح عمریاں وہی ہیں جن میں موضوع ہو بہو ویسا ہی پیش کیا گیا ہو جیسا کہ وہ ہے البتہ ان کی حقائق کا انبار نہیں لگایا جاتا بلکہ واقعات کے تانے بانے سے ایک جیتی جاگتی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ سوانح عمری کی دلچسپی سدا بہار ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ یہ کسی مشہور، نمایاں یا دلچسپ شخصیت کے بارے میں ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ تر اس بنا پر کہ اس کا موضوع فطرتِ انسانی ہے۔ چنانچہ سوانح عمری بطور فن بجا طور پر کسی بھی فرد سے متعلق ہو سکتی ہے چاہے کتنا ہی کمتر ہو۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ انسانی جذبات اور بشری محرکات کے دل میں کھب جانے والے تجزیے کا ذریعہ ہے۔ (ص 25)

نیز اسی کتاب میں ایک جگہ سیرت کے تعلق سے بھی کچھ بحث کی گئی ہے جو معلومات میں اضافہ کا سبب بن سکتی ہے لہٰذا ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے ''جامع اللغات میں سیرت کا مطلب سوانح عمری، فیروز اللغات علم تاریخ اور نسیم اللغات میں ذاتی جوہر بیان کیا گیا ہے۔ سیرت کا لغوی مفہوم اگرچہ کسی نیک سرشت انسانوں کا انفرادی کردار، مزاج، زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ اور اس کی سوانح عمری ہے۔ لیکن بنیادی طور پر اس سے حضور ﷺ کے حالات زندگی اور ان کے اخلاق و عادات کا بیان ہی مراد لیا جاتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ کئی صدیوں تک یہی طریقہ رہا۔ چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں مثلاً سیرت ابن حشام، سیرت اموی وغیرہ۔ ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں البتہ زمانہ مابعد میں مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں۔ مثلاً مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔ یوں تو سوانح نگاری اور سیرت نگاری، عربی، انگلش، فارسی اور دنیا کی مختلف زبانوں کے ذریعے طبع ہو کر منظر عام پر آئیں اور اپنی مقبولیت کے سکے لوگوں کے دلوں میں بٹھائیں لیکن اردو میں سوانح نگاری کی ابتداء علی گڑھ تحریک کے سر ہی جاتا ہے اور اس میں خود سرسید نے بہت ہی اہم رول ادا کیا ہے اور سیرت و سوانح کے موضوع پر دو کتابیں ہدیۂ قارئین کی ہیں ''سیرت مریدیہ'' آپ کے نانا دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین کی حالات زندگی اور

سوانح عمری ہے۔اس میں سرسید نے خود اپنے بچپن کے حالات کو قلمبند کیا ہے۔فنی لحاظ سے اصلاً یہی سیرت فرید یہ تو سوانح ہے۔ دوسری کتاب خطبات احمد یہ ، ۔ سرسید کے تمام علمی کارناموں میں ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ خطبات احمد یہ کی تصنیف ہے۔ یہ ان کے بارہ مقالات وخطبات پر مشتمل ہے۔ اس میں سرسید نے سر ولیم کی کتاب دی لائف آف محمد کا تنقیدی جائزہ لیا اور اس کی تمام ہرزہ سرائیوں کی مدلل بیخ کنی کی ہے۔ سرسید ایک بڑے مصنف تھے خطبات احمد یہ سے پہلے ان کی متعدد تصانیف منظر عام پر آچکی تھیں، مگر خطبات احمد یہ میں انہوں نے جو طرز تالیف اختیار کیا ہے وہ بلا شبہ منفرد طرز تحریر ہے، اخذ واستنباط، دلائل و براہین کے استعمال میں جو سلیقہ مندی اور تصنیفی شعور دکھائی دیتا ہے اس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ سرسید نہ صرف ایک بڑے مصنف بلکہ ایک بڑے سیرت نگار بھی تھے سیرت فرید یہ اپنے عہد کے اردو سوانح نگاروں میں ممتاز ہے تو خطبات احمد یہ بھی ان کی عظیم و بڑی کاوش قرار دی جاسکتی ہے۔

پھر آپ کے رفقاء میں دو سوانح نگار اپنی ذہانت و ذکاوت اور طرز تحریر، اسلوب نگارش، زبان و بیان اور رطرز استدلال میں منفرد و یکتا ہیں جن کے سبب خاص وعام میں مقبول ہوئے۔ان میں ایک رفیق خاص شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کا ہے' آپ نے مختلف حیثیتوں سے اردو ادب کو متاثر کیا۔مضمون نگاری، تنقید نگاری اور نظم و شاعری بالخصوص سوانح نگاری سے ۔حالی نے ہر ایک کے دلوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں جو بعد کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔مولانا حالی کے زمانے میں ملک کے سیاسی حالات نے جو کروٹ لی اس کا مولانا نے گہری نظر سے مشاہدہ کیا۔انہوں نے ہوا کا رخ پہچانا اور وقت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔وہ اس اصول پر عمل پیرا تھے کہ جدھر کو زمانہ پھرے تم بھی ادھر کو پھر جاؤ۔انہوں نے سرسید کو اپنا رہبر مانا اور اپنے قلم سے اردو ادب میں انقلاب پیدا کرنے کی سعی کی۔اپنی قوم کو بیدار کرنے اور اس کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے لئے مولانا حالی ضروری خیال کرتے تھے کہ قوم کے محسنوں کی سوانح لکھی جائیں۔اس ضرورت پر انہوں نے بار بار زور دیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ بیوگرافی چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو۔(اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ،ص۲۰۰)

چنانچہ مولانا نے سوانح نگاری کی وادی میں قدم رکھا اور حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید تین سوانحی کتابیں لکھیں جن سے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

حیات سعدی مولانا حالی کی پہلی تصنیف ہے جو 1881ء میں مکمل ہوئی۔ یادگار غالب مولانا حالی کی دوسری سوانحی کتاب ہے جسے شیخ اکرام نے حالی کی شاہکار تصنیف کہا ہے یہ 1896ء میں مکمل ہوئی۔ حیات جاوید سرسید کی سوانح عمری ہے جو 1883ء سے شروع ہوکر 1901ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ مذکورہ کتابیں آپ کی شہرت یافتہ اہم اور سوانح نگاری میں اولین درجہ رکھتی ہیں۔

سرسید کے رفقاء میں ایک اہم اور نمایاں نام شبلی نعمانی کا ہے۔آپ اس قدر جامع صفات اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے جس نے اپنی شہرت ، قابلیت ، صلاحیت ،طرز نگارش اور اسلوب بیان، زبان و بیان میں اپنا لوہا منوایا اور اردو ادب میں اپنی تحریریں اور تصنیفات سے گراں قدر اضافہ کیا اور عظیم خدمات

انجام دیں۔ اسلام کی گمشدہ عظمت یاد دلانے کے لئے انہوں نے سلسلۂ ناموران اسلام کے تحت متعدد سوانح عمریاں لکھنے کا منصوبہ بنایا اور بہت ہی اچھوتے اور نرالے انداز میں سیرت وسوانح کی کتابیں لکھ کر قارئین کی خدمت میں پیش کیں۔ شبلی کی شہرت یافتہ کتابیں، سیرۃ النبی، الفاروق، المامون، سیرۃ النعمان، الغزالی وغیرہ ہیں۔ سوانح میں اپنی شخصیت وقابلیت کا لوہا بلا تامل رفیق ورقیب ہر ایک سے منوایا۔ المامون 89-1887ء یہ اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے۔ سیرۃ النعمان 1891ء امام اعظم ابوحنیفہؒ کی سوانح عمری' الفاروق اسی سلسلے کی تیسری کتاب ہے جو فاروق اعظمؓ کی سوانح اور خدمات پر مشتمل ہیں۔ الغزالی اور سوانح مولانا روم قیام حیدرآباد کے زمانہ میں 1902ء میں لکھی گئیں۔ پھر سیرۃ النبی ﷺ 1910ء میں لکھی گئی آپ کے سوانحی سلسلے کی آخری مگر سنہری اور تابناک کڑی ہے۔ یہ کتاب ایسے وقت لکھی گئی جب مسلسل لکھنے کے بعد ان کے فن پر پوری طرح نکھار آچکا تھا اور سوانح نگاری کے فن پر آپ کو مکمل دسترس حاصل ہوگئی تھی اور نثر نگاری میں وہ اپنے تمام ہم عصروں سے سبقت لے جاچکے تھے۔ اپنی اس معرکہ آراء آخری تصنیف کو شبلی اپنی زندگی کا ماحصل اپنے فن کی معراج اور توشۂ آخرت خیال کرتے تھے۔ کتنے فخر سے فرماتے ہیں:

عجم کی مدح میں عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہو نا تھا

شبلی بڑی یکسوئی کیساتھ اس طرف متوجہ ہوئے۔ معتبر مواد فراہم کیا، دشمنان اسلام کے اعتراضات کے دنداں شکن جواب تلاش کئے اور جب لکھنے بیٹھے تو فصاحت و بلاغت، ایجاز و اطناب کا دریا بہادیا۔ سیرۃ النبی ﷺ کے بیشتر حصوں سے شعریت چھلکی پڑتی ہے۔ درست کہا گیا ہے کہ سیرت النبی کا پہلا حصہ دماغ سے دوسرا دل سے لکھا گیا لیکن افسوس یہ معرکہ آرا کتاب مکمل نہ ہوسکی۔ بعد میں سید سلیمان ندوی نے اس کی تکمیل کی۔ شبلی نعمانی نے بھی تنقید نگاری، مقالہ نگاری اور خاص طور سے اردو سیرت، سوانح نگاری میں اپنی پہچان آپ بنائی اور اس صنف میں اپنی خدمات جلیلہ وعظیمہ سے اردو ادب کو آگے بڑھانے میں مدد دی اور ساتھ ہی ساتھ ایک سنہرے باب کا آغاز ہوا جس کے شبلی وحالی امام کہلائے اور متاخرین کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

الغرض! اس تحریک کے ذریعہ سوانح نگاری کی بنیاد پڑی اور اس کے فروغ میں مولانا حالی اور خصوصیت کے ساتھ شبلی نعمانی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور حتی الوسع اس کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا، اور اس صنف کے روح رواں اور اولین سوانح نگار، کے ساتھ عظیم سوانح نگار کہلائے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ سوانح نگاری کا فن علی گڑھ تحریک ہی کے ذریعہ وجود میں آئیں سرسید نے ابتداء کی اور حالی نے اسے بڑھایا اور علامہ شبلی نعمانی نے اسے خوب خوب فروغ دیا اور اس کی اشاعت میں حتی المقدور عمدہ کوشش کی اور اسے خوب بڑھاوا دیا۔ اپنی اس سعی کو اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

☆☆☆

محمد کیف فرشوری بدایونی
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یو۔پی)

جگرؔ کے عقیدت مندوں میں شکیلؔ بدایونی بھی

جگرؔ مرادآبادی (۱۸۹۰-۱۹۶۰ء) تلمیذ رسا

جگرؔ کی ولادت ۶/ اپریل ۱۸۹۰ء مطابق ۱۵ شعبان ۱۳۰۷ھ کو مرادآباد میں ہوئی۔ آپ کا نام علی سکندر تھا۔ گھر کا ماحول ایسا ملا تھا کہ ۱۴ یا ۱۵ سال کی کم عمری میں ہی شعر کہنے لگے۔ اولاً کچھ غزلوں پر داغؔ سے بھی اصلاح لی، پھر منشی حیات بخش رساؔ سے ایک زمانے تک اصلاح لیتے رہے۔ بعد میں منشی امیراللہ تسلیمؔ سے بھی فیض حاصل کیا۔ جگرؔ کا نام سیمابؔ صاحب کی شاگردی میں بھی لیا گیا، جس کی تردید خود انھوں نے رازؔ مرادآبادی (ف ۱۹۸۲ء) کو لکھے ایک خط میں کی ہے۔ بہرحال بیسویں صدی میں قدیم رنگ تغزل کے علم برداروں میں جگرؔ کی حیثیت تمام غزل گو شعرا کے بیچ ایک ممتاز و مقبول غزل گو شاعر کی ہے اور آپ کی ذات سے خود شاعری کا ایک اسکول قائم ہو جاتا ہے کیوں کہ آپ کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ آپ نئی نسل کے نوجوان شعرا رازؔ مرادآبادی (ف ۱۹۸۲ء)، مجروحؔ سلطانپوری (ف ۲۰۰۰ء)، شکیلؔ بدایونی (ف ۱۹۷۰ء) اور خمارؔ بارہ بنکوی (ف ۱۹۹۹ء) کے کلام پر بھی نظر رکھتے تھے۔ ان میں رازؔ مرادآبادی تو آپ کے شاگرد خاص تھے۔ مگر شکیلؔ، خمارؔ اور مجروحؔ نے بھی آپ سے خوب فیض اٹھایا۔ شکیلؔ پر آپ علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں مہربان ہوئے۔

جگرؔ نے اپنے زمانے میں مشاعروں کو ایک خاص رنگ دیا۔ آپ مشاعروں میں شدت سے شرکت کرتے تھے، نوجوان شعرا کی ہمت افزائی نیز ان کے کلام پر خوب داد بھی دیتے تھے۔ غرض یہ کہ جگرؔ ممتاز غزل گو شاعر تھے اور آپ نے اپنی پوری زندگی شاعری کے لیے وقف کردی تھی۔ رندی، سرشاری و سرمستی آپ کے کلام کے نمایاں وصف ہیں اور آپ کا یہ رنگ آپ کے مذکورہ عقیدت مندوں کے یہاں بھی بحسن و خوبی شدت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ آخر میں جگرؔ کا ایک مشہور شعر ملاحظہ کریں جو جگرؔ کی شاعرانہ عظمت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے:

جان کر منجملہ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

رازؔ مرادآبادی کو جگرؔ سے تلمذ حاصل تھا اور مجروحؔ، خمارؔ، شکیلؔ سے جگرؔ کی ملاقاتیں یا تو مشاعروں کے دوران رہیں یا پھر دوسرے مقامات پر۔ ان چاروں معاصرین کی جگرؔ سے جہاں بھی ملاقاتیں رہیں ان سے ان حضرات کی عقیدت کا

اظہار ہوتا ہے اور معلوم پڑتا ہے کہ ان چاروں کے جگرؔ سے نیاز مندانہ تعلقات تھے اور ساتھ ہی ساتھ خود ان چاروں حضرات کے ایک دوسرے سے مراسم کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اب ہم ان چاروں حضرات کا ایک بعد دیگرے تذکرہ کریں گے جس سے ان کے تعلقات پر روشنی پڑے گی۔

مجروحؔ سلطانپوری (۱۹۱۵-۲۰۰۰ء):

اسرار حسن خاں مجروحؔ سلطانپوری یکم جولائی ۱۹۱۵ء کو گنجہڑی (سلطانپور) میں پیدا ہوئے۔ مجروحؔ اگرچہ ترقی پسند شاعر ہیں مگر ان کا شمار شکیلؔ کے اول درجے کے ہم عمر معاصرین میں بھی ہوتا ہے۔ بمبئی میں فلمی دنیا سے جڑنے کے بعد دونوں کا قیام بھی ساتھ ہی میں رہا۔ دونوں ہی جگرؔ صاحب کے خاص عقیدت مندوں میں تھے۔ جگرؔ صاحب کو بھی دونوں سے بہت محبت تھی اور وہ ان کے کلام کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بمبئی کی کسی ایک محفل میں فرمایا تھا کہ ''میری دو آنکھیں ہیں ایک شکیلؔ اور دوسری مجروحؔ (مجروحؔ سلطانپوری)''

شکیلؔ نے اپنے سوانحی حالات میں ان کا اکثر و بیشتر جگہ ذکر کیا ہے۔ بمبئی میں شکیلؔ نے جب تک اپنا خود کا مکان نہیں خریدا تھا تب تک وہ کاردار کے ہی دیے ہوئے مکان میں رہتے تھے بعد میں مجروحؔ بھی اسی مکان میں رہنے آ گئے تھے۔

شکیلؔ لکھتے ہیں:

''.....اپنی اہلیہ کی وفات کے سلسلے میں کافی دنوں کے لیے نوشاد صاحب لکھنؤ گئے تو اپنا مکان مجروحؔ سلطانپوری کے حوالے کر گئے۔ مجروحؔ صاحب نے اس مکان میں مجازؔ کو بھی رکھ لیا تھا۔''

مجروحؔ ترقی پسند شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ وہ ترقی پسند شعرا میں واحد ایسے شاعر ہیں کہ جنھوں نے غزل کو اپنے جذبات و احساسات کا ترجمان بنایا۔ جبکہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا اس کے سخت مخالف تھے مگر پھر بھی مجروحؔ نے غزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ صرف یہ ہی نہیں کہ اظہار کا وسیلہ بنایا بلکہ وہ تمام باتیں اور وہ مضامین جو بقیہ ترقی پسند شعرا نظموں کے ذریعہ ادا کر رہے تھے، انھوں نے غزل میں برت کر ایک مثال قائم کی۔ یقیناً یہ مجروحؔ کا ہی خاصہ تھا۔

لہٰذا ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''مجروحؔ سلطانپوری نے اردو غزل کو جو بانکپن دیا اور جو سرشاری عطا کی اور کلاسیکی رموز و علائم کو اپنے عہد کی سچائیوں سے ہم آہنگ کر کے جو نیا شعری لہجہ دیا ہے وہ انھیں کو زیب دیتا ہے اور ان کا منفرد کارنامہ ہے۔''

اسی لیے ان کی غزلیہ شاعری ایک منفرد انداز کی ہے جو مجروحؔ کو ایک ممتاز درجہ عطا کرتی ہے۔ مجروحؔ نے نہ صرف یہ کہ مغربی طاقتوں کے خلاف آواز اٹھائی بلکہ خود اپنے ملک میں موجود وطن کے غداروں مثلاً جاگیرداروں، سیاست دانوں، جو وطن کی آزادی میں روڑا بنے ہوئے تھے، کو بھی نہیں بخشا اور اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ اسی سلسلے کی ان کی ایک غزل کا مقطع ملاحظہ فرمائیں:

مجروحؔ قافلے کی مری داستاں یہ ہے
رہبر نے مل کے لوٹ لیا راہ زن کے ساتھ

اس وقت حالات یہ تھے کہ آزادی کے لیے اٹھنے والی آوازوں کو دبانے کے لیے برطانوی حکومت طرح طرح کے نسخے اپناتی تھی اور آزادی کے دیوانوں کو گرفتار کر جیل بھیج دیا جاتا تھا۔ لہٰذا مجروحؔ نے بھی وطن پرستی کے نغمے گاتے گاتے قید خانے کی صعبتوں کو جھیلا ہے۔ مگر اس سے ان کا حوصلہ پست نہیں ہوا بلکہ اور دوبالا ہوگیا۔ فرماتے ہیں:

روک سکتا ہمیں زندان بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

مجروحؔ نے اپنے جذبات واحساسات اور ہر طرح کے سیاسی و سماجی مسائل کے ادا کرنے کے لیے علامتی و استعاراتی انداز اختیار کیا اور یہ ہی ان کا خاصہ تھا۔ جگرؔ کے بقیہ عقیدت مندوں شکیلؔ اور خمارؔ کی طرح ان کا ترنم بھی منفرد انداز کا تھا۔ مجروحؔ کے یہاں بھی ایک خاص قسم کی نغمگی پائی جاتی ہے۔ ان کی ایک مشہور زمانہ غزل دیکھیں:

اہل طوفاں آؤ، دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو، بھنور کو چشم جانانہ کہیں
دار پر چڑھ کر لگائیں نعرہ زلف صنم
سب ہمیں باہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں
سرخی مے کم تھی میں نے چھو لیے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جو بھی اب ارباب میخانہ کہیں

ooo

تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہیے میکدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں
پارہ دل ہے وطن کی سرزمیں مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں
آرزو ہی رہ گئی مجروحؔ کہتے ہم کبھی
اک غزل ایسی جسے تصویر جانانہ کہیں

ooo

رازؔ مرادآبادی (۱۹۱۶۔۱۹۸۲ء) تلمیذ جگرؔ مرادآبادی:

شکیلؔ کے معاصرین میں رازؔ مرادآبادی کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ رازؔ سنہ ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ وہ شکیلؔ کے ہم عصر بھی ہیں اور ہم عمر بھی۔ رازؔ اور شکیلؔ دونوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طالب علمی کے دوران ہونے والے مشاعروں میں ایک ساتھ شریک ہوکر یونیورسٹی کی نمائندگی بھی کرتے تھے۔ اس سلسلے میں دونوں نے کافی انعامات بھی جیتے ہیں۔ رازؔ، جگرؔ مرادآبادی کے شاگرد خاص تھے، پہلے تو جگرؔ صاحب انھیں اپنا شاگرد بنانے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ مگر رازؔ کے سخت رویہ اختیار کرنے پر جگرؔ نے انھیں اپنا شاگرد بنالیا۔

اس بابت رازؔ لکھتے ہیں:

''.....جگرؔ صاحب کے قیام کو تین چار ماہ گزر گئے تو میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنا شاگرد بنالیں۔ جگرؔ صاحب ٹالتے رہے۔ ایک دن میں نے عجیب حرکت کی۔ میں نے ڈنڈا نکالا اور جگرؔ صاحب سے کہا کہ ''اب یہ ڈنڈا فیصلہ کرے گا''۔ جگرؔ صاحب کے ردعمل کی بہت واضح تصویر ذہن میں نہیں۔ بہرکیف انھوں نے مجھے اپنا شاگرد بنالیا اور ساجدؔ کی جگہ رازؔ تخلص رکھ دیا۔''

مذکورہ بالا اقتباس سے شاگردی کے علاوہ ایک اور دوسری بات یہ پتہ چلتی ہے کہ ابتدا میں رازؔ، ساجدؔ بھی تخلص رکھ

چکے ہیں۔ رازؔ اور شکیلؔ دونوں نے مسلم یونیورسٹی کی نمائندگی کرتے ہوئے بہت سے انعامات جیتے۔ دونوں اتنے مشہور ہو گئے تھے کہ ان کا نام ایک ساتھ لیا جانے لگا تھا۔ شکیلؔ نے اپنی سوانح عمری میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''.....اسی دن سے یونیورسٹی میں رازؔ، شکیلؔ دونوں کو ساتھ ساتھ مدعو کیا جانے لگا اور رازؔ کی غزلیں مشاعروں کے علاوہ ہوسٹلوں، بنگلوں اور مکانوں میں بھی گونجنے لگیں۔

..... چنانچہ میں اور رازؔ مرادآبادی جو یونیورسٹی کے محبوب ترین غزل گو شعرا تھے روزانہ کہیں نہ کہیں شعر خوانی کرتے ہوئے نظر آجاتے تھے۔''

اس زمانے میں آگرہ کے سینٹ جانس کالج میں مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ جس میں ہر یونیورسٹی کی جانب سے دو دو شاعر شرکت کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں شکیلؔ نے لکھا ہے کہ ''علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے میں اور رازؔ مرادآبادی نمائندگی کیا کرتے تھے۔ ہم نے تین چار سال مسلسل شیلڈ اور انعامات جیتے''ے۔

ان مشاعروں کا ذکر کرتے ہوئے رازؔ مرادآبادی بھی کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''.....میں نے بھی علی گڑھ کے مشاعروں میں پابندی کے ساتھ شرکت کی۔ بین الجامعاتی مشاعروں میں مَیں اور شکیلؔ بدایونی علی گڑھ کی نمائندگی کرتے۔ ہم نے اس زمانے میں کم و بیش ہر شیلڈ حاصل کی۔ پہلے اور دوسرے انعام بھی جیسے ہمارے نام لکھ گئے تھے۔''

بہر حال رازؔ مرادآبادی ایک نمائندہ غزل گو شاعر ہیں۔ وہ بھی شکیلؔ کی طرح حسن و عشق کے نغمے گاتے ہیں۔ رازؔ نے بھی عشق و عاشقی کے مضامین و مسائل اپنے مخصوص انداز میں بیان کیے ہیں۔ ان کے یہاں حسن و عشق، معاملہ بندی، ہجر و وصال، زلف و رخسار غرض یہ کہ ہر قسم کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ ان کے کلام پر جگرؔ کا اثر بھی خوب نمایاں ہے۔ وہ خالص محبت کے شاعر ہیں اور اپنے جذبات و احساسات کا بیان حسن و عشق کے دائرے میں کرتے ہیں۔ ان کے یہاں احساس کی شدت کے ساتھ ساتھ سرمستی بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے دیوان کا بیشتر حصہ عشق و محبت کی داستان کو محیط ہے۔ وہ طرح طرح سے محبت کے ترانے گاتے ہیں۔ آیئے اب رازؔ کی سرمستی ملاحظہ فرمائیں:

اے خوشا مستی و سرمستی و بدمستئ شوق
اپنی ہستی کا بھی احساس نہیں آج کی رات

ooo

ان کی روایتی غزل کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ توبہ، یہ تسلی، یہ عنایت، یہ کرم
حسن نے رکھ ہی لیا میری محبت کا بھرم
تونے بخشی میرے اشکوں کو گوہر کی قیمت
تونے رکھا مرے پندار محبت کا بھرم

ooo

رازؔ کے یہاں عشق و عاشقی کے مضامین کے علاوہ انسان دوستی کا جذبہ بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً:

کافر کہیں جسے، نہ مسلماں کہیں جسے
میں اس کو ڈھونڈتا ہوں کہ انساں کہیں جسے

جگرؔ صاحب سے اپنی نسبت کو انھوں نے اپنی غزل کے ایک مقطع میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

نسبت کہاں کسی کو کلام جگرؔ سے رازؔ
دیکھے ہیں ہم نے کتنے سخندانِ لکھنؤ

خمارؔ بارہ بنکوی (۱۹۱۹-۱۹۹۹ء):

محمد حیدر خاں خمارؔ بارہ بنکوی کی ولادت سنہ ۱۹۱۹ء بارہ بنکی میں ہوئی۔ اوائل عمر میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ ذوق شعری فطری تھا۔ ابتدا میں اپنے عم محترم قرارؔ بارہ بنکوی (ف ۱۹۴۵ء) سے اصلاح لی۔ اس سلسلے میں انھوں نے لکھا بھی ہے کہ ''زبان کی حد تک میں نے محترم (قرارؔ بارہ بنکوی) سے اصلاح لی۔ اس کے علاوہ خود اپنے ذوق سلیم کو اپنا رہبر بنایا''۹۔ شکیلؔ کے بے حد قریبی دوستوں میں تھے۔ شکیلؔ کی ان سے پہلی ملاقات مان پور نگریا (بدایوں) کے مشاعرے میں جگرؔ صاحب کے توسط سے ہوئی تھی۔ اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے شکیلؔ نے اپنے سوانحی حالات میں لکھا ہے کہ:

''جگرؔ صاحب ایک پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے پائنتی اسی پلنگ پر ایک نوجوان سانولے رنگ کے صاحبزادے شال اوڑھے بیٹھے تھے جگرؔ صاحب نے ان کا تعارف مجھ سے کرایا ''ان سے ملیے یہ ایک نوجوان خوش گو شاعر خمارؔ بارہ بنکوی ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔''

چنانچہ پہلی ملاقات کے بعد دونوں کے بیچ قربتیں اور بڑھتی چلی گئیں۔ خمارؔ، مجروحؔ اور شکیلؔ تینوں بمبئی میں ایک ہی اسٹوڈیو میں کام کرتے تھے۔ یہاں ان کی ملاقاتیں موسیقار نوشاد علی (ف ۲۰۰۶ء) سے بھی رہیں۔ نوشاد صاحب نے اپنی سوانح عمری میں اِن تینوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''.....جگرؔ مرادآبادی کے توسط سے اردو ادب کے تین بیش قیمت نگینے میرے ہاتھ آ گئے۔ تینوں قدر و قیمت کے اعتبار سے نایاب اور یکتائے روزگار، مجروحؔ، شکیلؔ اور خمارؔ کے بغیر نہ اردو کی شعری تاریخ مکمل ہوسکتی ہے اور نہ فلمی نغمہ نگاری کا حسن۔''

اپنے تمام ہم عصروں میں خمارؔ کا بلند درجہ اس لیے ہے کہ انھوں نے اس نازک سے دور میں کلاسیکی غزل کے گیسو سنوارے کہ جب غزل کی ہر طرف مخالفت ہو رہی تھی۔ انھوں نے نہ صرف غزل کہی بلکہ خوب کہی۔ ان کی غزل کی خوبی یہ ہے کہ وہ چھوٹی بحر کا انتخاب کرتے ہیں۔ عشق و عاشقی کے مضامین بڑے ہی دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ بیان میں سادگی و صفائی پائی جاتی ہے۔ خمارؔ صاحب اپنے محبوب پر کبھی طنز نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کے حسن و جمال کی تعریف اور وہ بھی خاص ترنم کے ساتھ اپنے منفرد انداز میں کرتے ہیں۔ خمارؔ کی شاعری کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں بلند درجے کی نغمگی پائی جاتی ہے۔ یہ نغمگی ایسی ہوتی ہے کہ جب آپ ان کی غزلوں کا مطالعہ کریں گے تو یقیناً ان غزلوں کی گنگناہٹ آپ کے ذہن میں ہونے لگے گی۔ ان کے ترنم کے سلسلے میں علی سردارؔ جعفری نے بالکل بجا فرمایا ہے:

''خمارؔ کے ترنم میں ایک نشاط انگیز سوز ہے۔ یہی

نشاط انگیز سوز ان کے شعروں میں بھی ہے مجھے یقین ہے کہ آپ کاغذ پر بھی ان کی گنگناہٹ محسوس کر سکتے ہیں۔''۱۲؎

اب خمارؔ کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

حسن جب مہرباں ہو تو کیا کیجیے
عشق کی مغفرت کی دعا کیجیے
کہوں کس طرح میں کہ وہ بے وفا ہے
مجھے اس کی مجبوریوں کا پتا ہے

ooo

وہی پھر مجھے یاد آنے لگے ہیں
جنھیں بھولنے میں زمانے لگے ہیں
وہ ہیں پاس اور یاد آنے لگے ہیں
محبت کے ہوش اب ٹھکانے لگے ہیں
سنا ہے ہمیں وہ بھلانے لگے ہیں
تو کیا ہم انھیں یاد آنے لگے ہیں

ooo

سنبھالے تو ہوں خود کو تجھ بن مگر
جو چھولے کوئی تو بکھر جاؤں میں
اگر تو خفا ہو تو پروا نہیں
ترا غم خفا ہو تو مر جاؤں میں
ہم انھیں وہ ہمیں بھلا بیٹھے
دو گنہگار زہر کھا بیٹھے

ooo

خمارؔ کے یہاں شکیلؔ کی ہی طرح مومنؔ (ف۱۸۵۲)، فانیؔ (ف۱۹۴۱ء) اور جگرؔ (ف۱۹۶۰ء) کے رنگ کا اثر موجود ہے۔ وہ ان حضرات کے رنگ میں خوب غزلیں کہتے ہیں۔ ان کی شاعری کا اہم وصف یہ ہے کہ وہ حسن وعشق کے مضامین و مسائل بڑے ہی دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے یہاں مومنؔ کا اثر خاص طور پر نمایاں ہے۔ مومنؔ ہی کی طرح انھوں نے بھی اپنے تخلص سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں:

حشر کا دن ابھی دور ہے خمارؔ
آپ کیوں زاہدوں میں جا بیٹھے
خمارؔ بلا نوش تو، اور توبہ
تجھے زاہدوں کی نظر لگ گئی ہے
قیامت یقیناً قریب آ گئی ہے
خمارؔ اب تو مسجد میں جانے لگے ہیں
کہاں تو خمارؔ اور کہاں کفر توبہ
تجھے پارساؤں نے بہکا دیا ہے

شکیلؔ بدایونی (۱۹۱۶–۱۹۷۰ء) تلمیذ ضیاؔ القادری بدایونی:

شکیل احمد شکیلؔ بدایونی ۳/اگست ۱۹۱۶ء مطابق ۳/شوال ۱۳۳۴ھ بدایوں کے ایک علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت مولانا ضیاؔ القادری کے زیر سایہ ہوئی۔ شعر وشاعری کا ذوق بچپن سے ہی تھا، اس لیے بڑے ہو کر مولانا سے ہی شرف تلمذ حاصل کیا۔

اپنے ہم عصروں کے بیچ شکیلؔ کی شاعری کی عظمت یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے ہنگاموں کے بیچ جبکہ غزل کی چاروں طرف مخالفتیں ہو رہی تھیں، اس نازک سے دور میں شکیلؔ نے نہ صرف یہ کہ غزل کو اپنی شاعری کے لیے منتخب کیا

بلکہ اس کو خوب برتا اور اس کے گیسو بھی سنوارے۔ وہ کلاسیکی غزل کے شیدائی بن کر سامنے آئے۔ مجروحؔ کو چھوڑ دیں تو خمارؔ نے بھی اس سلسلے میں ان کا خوب ساتھ دیا۔

شکیلؔ کے ان تینوں ہم عمروں کا اردو ادب میں اپنا الگ الگ مقام ہے۔ رازؔ خالص حسن و عشق کے نغمے گاتے ہیں۔ مجروحؔ وہ پہلے اور واحد شاعر ہیں کہ جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بقیہ شعرا کے مقابلے میں غزل کو اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ خمارؔ نے کلاسیکی غزل کا دامن تھام کر حسن و عشق کے نئے نئے مضامین کو منفرد لب و لہجہ کے ساتھ ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ شکیلؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ کلاسیکی غزل کے گیسو سنوارے بلکہ استاد وقت جناب جگرؔ مرادآبادی (ف ۱۹۶۰ء) کے اثر کو اپنے تمام معاصرین میں سب سے زیادہ قبول کیا۔ جگرؔ کی رندی، سرمستی و سرشاری ان کے یہاں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہی مے خواری و مے نوشی کے مضامین جو جگرؔ کے کلام کا خاصہ ہیں ان کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے بھی زاہد و واعظ پر طنز کی بوچھار کی ہے، جام و مینا کی باتیں ان کے یہاں بھی شدت سے پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

اٹھا جو مینا بدست ساقی رہی نہ کچھ تاب ضبط باقی
تمام مے کش پکار اٹھے، یہاں سے پہلے، یہاں سے پہلے
پی شوق سے واعظ ارے کیا بات ہے ڈر کی
دوزخ ترے قبضے میں ہے جنت ترے گھر کی
اکتا ہی جائیں گے کبھی پینے سے بادہ خوار
چلتا ہے دور جام تو چلنے بھی دیجیے
زاہد کی مے کشی پہ تعجب نہ کیجیے
لاتی ہے رنگ فطرت آدم کبھی کبھی
یہ اعلان تقدس اور یہ میخواریاں واعظ
تجھے منجملہ ارباب فن کہنا ہی پڑتا ہے
میں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی تلاطم، تری زندگی کنارا
وہ اٹھے ہیں لے کے خم و سبو ارے او شکیلؔ کہاں ہے تو
ترا جام لینے کو بزم میں کوئی اور ہاتھ بڑھا نہ دے
نہ ساغر ہے نہ پیمانہ، نہ ساقی ہے نہ میخانہ
شکیلؔ اب چند اشکوں پر گزارا کر رہا ہوں میں
اترا وہ خمار بادۂ غم رندوں کو ہوا ادراک ستم
کھلنے کو ہے میخانے کا بھرم اب پیر مغاں کی خیر نہیں

اس قسم کے اشعار ان کے یہاں ہر دوسری غزل میں موجود ہیں۔ شکیلؔ نے نہ صرف جگرؔ کے رنگ کو قبول کیا بلکہ اپنی شاعری میں کامیابی کے ساتھ برتا بھی۔ جگرؔ کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں مومنؔ (ف ۱۸۵۲ء) و فانیؔ (۱۹۴۱ء) کا بھی اثر نمایاں ہے۔ وہ کلاسیکی غزل کے شیدائی ہیں، اسی لیے اپنے بزرگوں کے اثر کو قبول کرتے ہیں۔ حسن و عشق کے مضامین و مسائل کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں۔ شکیلؔ سادہ مزاج تھے، انھوں نے اپنے جذبات و احساسات کے لیے غزل کا انتخاب کیا۔ ان کی شخصیت کی یہی سادگی و صفائی ان کی غزل میں بھی پائی جاتی ہے۔ نغمگی ان کی غزلوں کا خاصہ ہے۔ مشاعروں میں غزلیں اپنے مخصوص ترنم میں

پڑھا کرتے تھے۔ان کی اسی رنگ کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

غم جاناں، غم ہستی، غم حالات شکیلؔ
کیا کہوں کتنی بلائیں ہیں مری جان کے ساتھ

اگر اس زندگی میں غم نہ ہوتے
تو خوش رہنے کو شاید ہم نہ ہوتے

دعا کے لیے ہاتھ پھیلا کے دیکھے
دعاؤں میں کوئی اثر بھی نہیں ہے

ooo

میں غم جہاں سے نڈھال ہوں کہ سراپا حزن وملال ہوں
جو لکھے ہیں میرے نصیب میں وہ الم کسی کو خدا نہ دے

انھیں اپنے دل کی خبریں مرے دل سے مل رہی ہیں
میں جو ان سے روٹھ جاؤں تو پیام تک نہ پہنچے

ooo

شکیلؔ عمر بھر غزل کے شیدائی رہے اور یہ میدان ان کا پسندیدہ تھا۔وہ خود فرماتے ہیں:

میں شاعر شباب رہوں گا سدا شکیلؔ
ڈھلنے لگی ہے عمر تو ڈھلنے بھی دیجیے

تفسیر دو عالم ہے شکیلؔ اپنا تغزل
میدان غزل چھوڑ کے ہم جا نہیں سکتے

ooo

شکیلؔ کے ہم عمروں میں ان کی دوسری امتیازی حیثیت یہ ہے کہ فلمی دنیا میں بھی ایک نغمہ نگار کی حیثیت سے ان کا کوئی ثانی نہیں۔ساحرؔ، مجروحؔ، خمارؔ اور شکیلؔ چاروں فلمی دنیا سے وابستہ رہے اور چاروں کا زمانہ بھی ایک ہی ہے۔ان میں سے اگر ہم صرف ساحرؔ کی ہی بات کریں کیوں کہ وہ نغمہ نگاری کی دنیا میں بھی ممتاز درجہ رکھتے ہیں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح اپنے ایک گیت میں تاج محل کو بادشاہ وقت کا غرور وتکبر بتا دیا۔

فرماتے ہیں:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

اب شکیلؔ کا لہجہ دیکھیے جب انھیں اس سلسلے میں موقع ملا تو کس طرح انھوں نے فرمایا:

اک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل
ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی ہے

ooo

لہٰذا دونوں ہی بلند مرتبہ شاعر ہیں اور دونوں نے تاج محل کو اپنی اپنی نگاہ سے دیکھا، جس کا فرق صاف واضح ہے۔ان دونوں نغموں کے تقابل سے دونوں ہی شاعروں کے مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے۔اس کے باوجود شکیلؔ کو وہ مقام نہیں مل سکا کہ جس کے وہ حق دار تھے، جو انھیں ملنا چاہیے تھا۔جبکہ وہ خود فرماتے ہیں:

اردو کو جس انداز بیاں کی ہے ضرورت
ملتا ہے وہ انداز بیاں میری غزل میں

ہے ظلم شکیلؔ اہل سیاست کا یہ ورنہ
گنجائش تنقیص کہاں میری غزل میں

☆☆☆

نفیس عائشہ
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اُردو
عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔تلنگانہ اسٹیٹ

غالبؔ کے کلام میں استعارہ کی تصریح

استعارہ، مجاز کی ایک قسم ہے ۔اس لئے استعارہ کی تعریف لکھنے سے پہلے مناسب ہے کہ مجاز کی تشریح کردی جائے۔

مجاز کی تعریف: جب کسی لفظ کے اصلی معنی ترک کر کے دوسرے معنی میں کسی مناسبت کی وجہ سے استعمال کریں تو یہ استعمال مجاز کہلاتا ہے اور اگر اصلی معنی میں استعمال کیا جائے تو اس کو حقیقت کہتے ہیں۔

مجاز کی قسمیں: اکثر استعمال کے لحاظ سے مجاز کی چار قسمیں ہیں۔جیسے کہ:

۱) مجازلغوی ۲) مجازشرعی
۳) مجازعرفی ۴) مجازاصلاحی

۱) مجازلغوی: اگر اہل شریعت و مذہب کسی لفظ کو دوسرے معنی میں کسی مناسبت کی وجہ سے استعمال کریں تو وہ مجاز شرعی کہلاتا ہے۔جیسے کہ لفظ شیر کسی بہادر کے لئے استعمال کیا جائے۔

۲) مجازشرعی: اگر اہل شریعت و مذہب کسی لفظ کو دوسرے معنی میں کسی مناسبت کی وجہ سے استعمال کریں تو وہ مجاز شرعی کہلاتا ہے ۔مثلاً لفظ صلوٰۃ کے لغوی معنی دعا کے ہیں ۔لیکن ارباب شریعت نے انہیں نماز کے لئے مخصوص کرلیا ہے۔

۳) مجازعرفی: اگر عام اشخاص ایک لفظ کو جو ان کے محاوروں میں کسی معین معنی کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔اس معنی سے ہٹا کر کسی دوسرے معنی میں استعام کریں تو یہ مجاز عرفی ہوگا ۔مثلاً مفرید عوام کے نزدیک امام حسینؓ کے روضہ کی نقل کو کہتے ہیں،لیکن اگر وہ اس لفظ کو قائم پرستی کے معنی میں استعمال کریں تو یہ مجاز عرفی ہوگا اور نقل روضہ کے معنی میں حقیقت عرفی۔

۴) مجازاصلاحی: اگر کوئی خاص جماعت مثلاً نحوی صرفی اور منطقی کسی نقطہ کو اپنی اصلاحی سے ہٹا کر دوسرے معنی میں استعمال کریں تو مجاز اصلاحی کہا جائے گا ۔جیسے لفظ فعل کے لغوی معنی کرو کے ہیں لیکن صرفیوں کی اصلاح میں فعل اس نقطہ کو کہتے ہیں جو کسی کام کو بنانے اور تین زبانوں میں سے کوئی زمانہ اس میں پایا جائے ۔اب اگر صرفی اس لفظ کو اپنے اصلاحی معنی میں استعمال کریں گے تو حقیقت اصلاحی ہوگا اور اگر کرنے کے معنی میں استعمال کریں گے ''مجاز اصلاحی'' ہوگا۔

استعارہ کی تعریف:

جب کسی لفظ کے حقیقی معنی ترک کر کے مجاز معنی میں استعمال کریں تو دونوں معنوں میں کوئی نہ کوئی لگاؤ ضرور ہوگا ۔اگر

یہ لگاؤ اور تعلق تشبیہ کا ہے تو اس استعارہ کہتے ہیں ،ورنہ مجازمرسل۔

لہذا استعارہ اس مجاز کو کہتے ہیں جس کے استعام کرتے وقت حقیقی اور مجازی معنی میں تشبیہ کا تعلق ملحوظ رکھا گیا ہو جیسے معشوق کے لئے گل کے لفظ استعمال کریں تو یہ استعارہ ہوگا کیونکہ کہنے والے نے گل کے اصلی معنی چھوڑ کر مجازی طور پر اس سے معشوق مراد لیا ہے اور گل و معشوق میں تشبیہ کا تعلق ہے۔

استعارہ میں ارکان تشبیہ کے نام:

مشبہ بہ کی ذات کو مستعار منہ کہتے ہیں اور جو لفظ اس کے لئے استعمال کیا جائے وہ مستعار کہلاتا ہے اور مشبہ کا نام مستعارلہ ہوتا ہے اور وجہ مشبہ وجہ جامع کہلاتی ہے۔مثلاً شیر کا لفظ مرد شجاع کے معنی میں استعمال کریں تو مرد شجاع کی ذات مستعارلہ،لفظ شجاع مستعار،شیر مستعار منہ اور شجاعت وجہ جامع ہوگی۔

فائدہ.....طرفین اور وجہ جامع کے حتی اور عقلی ہونے میں استعارہ کے جملہ حالات سے تشبیہ کے مثل ہیں اور وہی مثالیں جو تشبیہ میں دی گئی ہیں،مشبہ کو حذف کرنے کے بعد استعارہ کی مثال بن سکتی ہیں

استعارہ کی غرض:

استعارہ کی غرض یہ ہوتی ہے کہ یہ دعویٰ کریں کہ مشبہ بہ عین ہے۔مثلاً کسی سخی کے لئے استعارہ کے طور پر بادل کا لفظ بولیں تو اس سے یہ مراد ہوگی کہ وہ سخی اس قدر دولت برساتا ہے کہ خود بادل بن گیا ہے۔

استعارہ اور کذب کا فرق:

استعارہ میں کسی مناسبت اور تاویل کے ذریعہ سے یہ دعویٰ کہ مشبہ مشبہ بہ کی جنس سے ہے اور اصلی معنی مراد لینے پر ایک ضرر بند ہوتا ہے۔بخلاف کذب کے اس میں نہ تاویل ہوتی ہے نہ ضرر بند۔بلکہ جھوٹا آدمی ہمیشہ یہی کوشش کرتا ہے کہ میرے کلام کے ظاہری معنی درست ہو جائیں۔

استعارہ کے شرائط:

سب سے پہلے شرط یہ کہ استعارہ میں ارکان تشبیہ میں سے یا مشبہ مذکور ہو یا مشبہ بہ دونوں ساتھ مذکور نہیں ہوتے دوسری شرط یہ ہے کہ جس وقت صرف مشبہ مذکور ہو اس وقت مشبہ بہ کے مناسبات ضرور بیان کئے جائیں' ورنہ استعارہ نامکمل رہ جائے گا۔ ذیل کی قسم سے ان شرائط کی توضیح ہو جائے گی۔

استعارہ کی قسمیں طرفین کے حذف وذکر کے لحاظ سے :

مشبہ اور مشبہ بہ کے حذف وذکر کے لحاظ سے استعارہ کی دو قسمیں ہیں۔

۱) استعارہ بالتصریح.....۲) استعارہ بالکنایہ

۱) استعارہ التصریح: وہ استعارہ ہے جس میں (مشبہ بہ) مستعارہ منہ کا ذکر کیا گیا ہو اور (مشبہ) مستعارلہ،مذکور نہ ہو۔جیسے:

ربط رہنے لگا اس شمع کو پروانے سے
آشنائی کا کیا حوصلہ بیگانوں سے

اس مثال میں محض مشبہ بہ (مستعارمنہ) یعنی شمع اور پروانہ کا ذکر ہے مشبہ (مستعارلہ) یعنی عاشق،معشوق کا

کوئی ذکر نہیں۔

۲) استعارہ بالکنایہ: وہ استعارہ ہے جس میں (مشبہ بہ) مستعارہ منہ کا ذکر کیا گیا ہو، لیکن اس صورت میں یہ شرط ہے کہ مشبہ بہ کے مناسبات ضرور بیان کئے جائیں:۔

میں ممکن کہ کلک فکر کے لئے شعر سب اچھے
برستا ہے بہت نیساں گہر ہوتے ہیں کم پیدا

اس مثال میں فکر کو ایک منشی سے تشبیہ دی ہے اور مشبہ بہ یعنی منشی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن کلک جو منشی کے لئے لازم ہے اور مناسب ہے، مذکور ہے، جو قرینہ ہے کہ یہاں فکر کو منشی سے تشبیہ دی گئی۔

استعارہ تخلیہ: استعارہ بالکنایہ میں جو قرینہ ہوتا ہے اس کا نام استعارہ تخلیہ ہے۔ جیسے مثال مذکورہ بالا میں قلم کا ذکر کرنا منشی کے محذوف ہونے پر قرینہ ہے، اس قرینہ کو استعارہ تخلیہ کہتے ہیں۔

طرفین کے اجتماع کے لحاظ سے استعارہ کی قسمیں:

مستعارہ لہ (مشبہ) اور مستعارہ منہ (مشبہ بہ) کے ایک ذات میں جمع ہو سکنے کے لحاظ سے استعارہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) دفاقیہ (۲) عنادیہ

(۱) دفاقیہ: وہ استعارہ ہے جس مستعارہ لہ اور مستعارہ منہ کا اجتماع ایک شخص میں ممکن ہو۔ مثلاً ہدایت کا زندگی اور جہل کا کوری سے استعارہ کریں تو یہ ممکن ہے کہ ان کے طرفین ہدایت وزندگی اور جہالت مرکوری ایک ذات میں جمع ہو جائیں۔

(۲) عنادیہ: وہ استعارہ ہے جس میں مستعارلہ، اور مستعارمنہ کا اجتماع ایک شخص میں ممکن نہ ہو مثلاً:۔

وہاں تو سیم وزر اُن کی نظر میں خاک نہیں
یہاں ہم ایسے تو انگر کے گھر میں خاک نہیں

اس شعر میں مفلس کا تو انگر سے استعارہ کیا ہے اور یہ دونوں یعنی مفلسی اور توانگری ایک شخص میں جمع نہیں ہو سکتیں۔

فائدہ... جو استعارہ استہزار وظرافت کے طور پر ہو وہ عناد ید میں داخل ہے جیسے بزدل کے لئے کہیں کہ ہم نے ایک شیر دیکھا۔

وجد جامع اور طرفین کے معنوی تعلق کے لحاظ سے استعارہ کی قسمیں:

وجد جامع اور طرفین کے تعلق کے لحاظ سے استعارہ کی دو قسمیں ہیں:

۱) یہ کہ وجہ جامع مستعارلہ اور مستعارمنہ کے مفہوم میں داخل ہو لیتی ان کے معنی کا جزو ہو مثلاً (مسرور) نامہ لے کر ہُوا ہَوا قاصد۔ اس مثال میں دوڑنے کا استعارہ ہَوا ہونے سے کیا گیا ہے اور وجہ جامع مسافت تیزی سے قطع کرنا ہے جو دوڑنے اور ہَوا ہونے کا دونوں کے مفہوم میں داخل ہے۔

۲) یہ کہ وجہ جامع دونوں مفہوم سے خارج ہو۔ مثلاً انسان کا استعارہ شیر سے کریں تو اس صورت میں وجہ جامع یعنی شجاعت دونوں مفہوم سے خارج ہوگی۔

وجہ جامع کے عموم وخصوص کے لحاظ سے استعارہ کی قسمیں:

وجہ جامع کے عام اور خاص ہونے کے لحاظ سے استعارہ کی دو قسمیں ہیں: ۱) عامہ یا متبذلہ (۲) غریبہ

۱) استعارہ عامیہ یا متبذلہ: وہ استعارہ جس کی وجہ جامع اس قدر مشہور اور عام ہو کہ کہتے ہی سمجھ میں آجائے۔ جیسے زلف کا استعارہ سانپ سے کیا جائے تو وجہ جامع سیاہی اور لہرانا بالکل عام ہے جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

۲) استعارہ غریبہ: وہ استعارہ ہے جس کی وجہ جامع بغیر غور و تامل کے سمجھ میں نہ آئے جیسے۔

فغاں مجھ مست بن پھر خندہ ساغر نہ ہوئے گا
نے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے روئے گا

اس شعر میں شیشہ کی آواز کا ہچکی سے استعارہ کیا ہے جس کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔

مستعارہ لہ اور مستعارہ منہ اور وجہ جامع کے حسی اور عقلی ہونے کے لحاظ سے استعارہ کی قسمیں:

مستعارلہ، مستعارمنہ اور وجہ جامع کے حسی اور عقلی ہونے کے لحاظ سے استعارہ کی چھ قسمیں ہیں:

۱) یہ کہ تینوں حسی ہوں..... جیسے چاند سے، خوبصورت چہرہ کا استعارہ کریں۔

تو چاند (مستعارمنہ) خوبصورت چہرہ (مستعارلہ) اور آب وتاب (وجہ جامع) تینوں حسی ہوں گے۔

۲) یہ کہ طرفین حسی ہوں اور وجہ جامع عقلی ہو۔ جیسے مرد شجاع کا شیر سے استعارہ کریں تو وجہ جامع یعنی جرأت ہوگی۔

۳) یہ کہ مستعارمنہ حسی ہو اور مستعارلہ اور وجہ جامع عقلی ہوں۔

چرخ پر بیٹھ رہے جان بچا کر بیٹھے
ہو سکا جب نہ مداوا تیرے بیماروں کا

اس شعر میں مستعارمنہ یعنی بیٹھ رہنا حسی ہے اور مستعارلہ یعنی باز رہنا اور وجہ جامع اور سکون دونوں عقلی ہیں۔

۴) یہ کہ مستعارلہ، حسی ہو اور مستعارمنہ اور وجہ جامع عقلی ہوں جیسے معشوق کے قد کا استعارہ قیامت سے کریں تو مستعارلہ یعنی قد حسی ہو گا اور مستعارمنہ یعنی قیامت اور وجہ جامع مشبہ انگیزی دونوں عقلی ہوں گے۔ جیسے امیر۔

وہ قد و قیامت وہ خال آفت غضب کے نیٹو بلا کی جنون
نگاہ و ناوک بھی برق بھی ہے کہاں ہے ابرو ہلال بھی ہے

۵) تینوں عقلی ہوں..... جیسے خواب کا استعارہ موت سے کریں تو خواب کی کیفیت (مستعارلہ) موت کی حالت (مستعارمنہ) اور بیخبری (وجہ جامع) سب عقلی ہوں گے۔

۶) طرفین حسی ہوں اور وجہ جامع حسی اور عقلی اجزاء سے مرکب ہوں جیسے کسی جلیل القدر شخص کا آفتاب سے استعارہ کریں تو اس میں وجہ جامع خوبروئی اور بلندی شان ہونگی۔ جن میں خوب روئی حسی، در بلندی شان عقلی ہے۔

لفظ مستعار کے لحاظ سے استعارہ کی قسمیں:

لفظ مستعار کے لحاظ سے استعارہ کی دو قسمیں ہیں:

۱) اصلیہ ۲) تنبیہ

فائدہ.... استعارہ اصلیہ کی تعریف لکھنے سے پہلے اس امر کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر نام وہ جو بہت سی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہو وہ اسم جنس کہلاتا ہے۔ مثلاً پھول اور بت وغیرہ اور وہ نام جو فی الحال ایک جز کے لئے بولا جاتا ہے، لیکن اگر ویسی بہت سی چیزیں پائی جائیں تو ان کے لئے بولا جا سکے جیسے چاند اور سورج وغیرہ مشبہ ''اسم جنس'' کہلاتا ہے۔

۱) استعارا صلیہ .....وہ استعارہ ہے جس میں لفظ

مستعار اسم جنس یا مشبہ اسم جنس ہو۔

اسم جنس کی مثال ..... جب مرد شجاع کا استعارہ بہتر سے کریں گے تو ذات شیر مستعار منہ اور لفظ شیر مستعار ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ لفظ شیر اسم جنس ہے جو ایک قسم کی بہت سی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

مشبہ اسم جنس کی مثال ..... جب کسی گانے والے کا استعارہ زہر سے کریں گے تو زہرہ ستارہ کی ذات مستعار منہ اور لفظ زہرہ مستعار ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ زہرہ۔

استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جس میں لفظ مستعار (فعل شہد فعل یا حرف و مستعار کے فعل ہونے کی مثال۔ غالبؔ:

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

اس شعر میں بے حد خواہش مند ہونے کا (مرتے ہیں) سے استعارہ کیا ہے اور یہ فعل ہے ۔مستعار کے شبہ فعل ہونے کی مثال۔

کفر و سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے اڑ جائے
رنگ عاشق کی طرح رونق بت خانہ حسیں

اس شعر میں قدر و قیمت کم کر دینے کا استعارہ (سوز سے کیا گیا ہے)

طرفین کی مناسبات کے لحاظ سے استعارہ کی قسمیں:

طرفین کی مناسبات کا ذکر کرنے کے لحاظ سے استعارہ کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) مطلقہ (۲) مجردہ (۳) مرشحہ (۴) موشحہ

۱) ''مطلقہ'' وہ استعارہ ہے جس میں مستعار لہ اور مستار منہ کسی کے بھی مناسبات مذکور نہ ہوں جیسے ناسخ:

جذب دل کھینچ ہی لاتا ہے اسے کوسوں سے
کر چکا ہے وہ قسم مجھ سے کئی بار گریز

اس شعر میں معشوق کا استعارہ ضم سے کیا گیا ہے اور دونوں میں سے کسی کے مناسبات مذکور نہیں۔

۲) ''مجردہ'' وہ استعارہ ہے جس میں صرف مستعار لہ کے مناسبات مذکور ہوں جیسے

آنکھ اٹھا کر دیکھ تو اے نرگس جادوئے دوست
جھک تسلیمات کرتے ہیں کیسے ابرائے دوست

اس شعر میں آنکھ کا نرگس سے استعارہ کیا گیا ہے اور آنکھ کی مناسبت سے ابرو نظم ہوا ہے۔

۳) ''مرشحہ'' وہ استعار ہے جس میں مستعار منہ کے مناسبات مذکور ہوں۔

جیسے ع۔امیر.. دل کے ہر زخم کو مژگاں سے رفو کرتے ہیں۔

اس شعر میں مژگاں مستعار لہ ہے اور رسوئی مستعار منہ اور رفو جو مستعار منہ کا مناسب ہے مذکور ہے۔

۴) ''موشحہ'' وہ استعارہ ہے جس میں مستعار لہ اور مستعار منہ دونوں کے مناسبات مذکور ہوں جیسے سودا:

تجھ کو چمن میں آتے سن کر بادِ سحر یہ گھبرائی
ساغر جب تک لا دیں لا دیں تو ڑ سبو کو جام کیا

اس شعر میں مستعار لہ غنچہ اور گل ہیں جن کے مناسب چمن و بادِ سحر ہیں اور مستعار منہ سبو و جام ہیں جن کے مناسب ساغر اور معشوق کا ذکر ہے۔

☆☆☆

سید یوسف صدیق
ریسرچ اسکالر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد

دکن میں تراجم قرآن کا ایک جائزہ

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کے عربوں سے تعلقات اسلام کی آمد سے پہلے ہی سے رہے ہیں۔ اسلام کی آمد کے بعد عربوں کے ہندوستان سے تعلقات مزید بہتر ہوگئے۔ یہاں مسلمانوں کو مختلف علاقوں میں مختلف زبانوں اور مختلف تہذیبوں سے واسطہ رہا، مسلم مبلغین ہوں یا حکمراں ہر ایک کو مقامی کی زبان سیکھنا ضروری ہوگیا۔ اس طرح جو بولیاں یا زبانیں ہندوستان میں مروج ہوئیں ان میں دکنی بھی شامل ہے۔ دکن میں رائج قدیم اردو کو ہی دراصل دکنی کہا جاتا ہے۔ اس دوران ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ وترویج اور مقامی مسلمانوں تک خدائی پیغام پہنچانے کی ذمہ داری پورا کرنے کے لیے ترجمہ قرآن کی ضرورت ہمیشہ سے تھی لیکن اس کے لیے کوئی باقاعدہ پروگرام کے تحت قدم نہیں اٹھایا گیا۔

برصغیر میں قرآن شریف کے اولین تراجم اولیاء اللہ کی دین ہیں، یہ فقیر منش حضرات تقریری طور پر بیان قرآن کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ اس وقت جب برصغیر ہندوستان میں عربی اور پھر فارسی کا چلن تھا لیکن کثیر تعداد میں عوام بلا لحاظ علاقہ زبان اردو/ ہندوی/ دکنی جانتے اور بولتے تھے۔ اس وقت کے علماء نے تبلیغ دین کے لیے اس بول چال والی زبان میں اپنا مدعا عرض کرنے لگے اس طرح قرآن کریم اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح ترجمہ کے ذریعہ ہونے لگی۔ کئی بزرگوں نے عوام الناس کے افادہ کے لیے ایسے اشعار، بیت وغیرہ کہتے تھے جن کے مفاہیم قرآنی آیات اور احادیث سے منسلک رہتے تھے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے ابتدائی ہی سے قرآن کی تشریح وترویج پر توجہ دی گئی۔ لیکن ہندوستان میں قرآن شریف کے باضابطہ تراجم کی ابتداء کہاں سے ہوئی اس پر مختلف رائے ہیں۔ بعض کے ہاں ہندوستان میں قرآن شریف کے تراجم کی ابتداء سندھ سے ہوئی۔ ظاہر ہے اس خیال میں پختگی اس لیے بھی ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے مسلمان سندھ میں ہی حاکم رہے۔ مولوی محمد عالم مختارحق نے اپنے مضمون ''قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر'' مطبوعہ رسالہ فیض الاسلام راولپنڈی قرآن نمبر میں سنہ 270 ھجری کے ہندی زبان میں کئے گئے

قرآن مجید کے اس ترجمہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں کہ:

''اسلام کے قدم سندھ میں پہلی صدی ہجری کے آخر تک پہونچ چکے تھے۔ مگر یہاں کی مقامی زبان میں ترجمہ قرآن مجید کا ذکر ہمیں تیسری صدی ہجری کے مشہور سیاح بزرگ بن شہریار ناخدا سے ملتا ہے۔ جس کا سفرنامہ روس میں طبع ہو چکا ہے۔ چنانچہ ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ 270 ہجری میں شمالی پنجاب کے حاکم نے منصورہ (سندھ) کے مسلمان حاکم عبداللہ بن عبدالعزیز سے درخواست کی تھی کہ اس کے لیے ہندی (سندھی) زبان میں قرآن مجید کے ترجمہ کا اہتمام کیا جائے۔ انہوں نے ایک عراقی عالم کو جس کی پرورش اسی سرزمین میں ہوئی تھی اس کام پر مامور کیا جس نے قرآن مجید کا ترجمہ سورہ یٰسین تک کیا جس کا مطالعہ کے بعد ہندو راجہ اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا۔''

(قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر کا تنقیدی مطالعہ 1914 تک' از: ڈاکٹر سید حمید شطاری)

بارہویں صدی ہجری میں اردو زبان برصغیر پاک و ہند میں نہ صرف ادبی زبان بن کر اُبھر رہی تھی بلکہ کثیر تصنیفات و تالیفات اور تراجم کے باعث ایک عام فہم زبان بھی بنتی جارہی تھی ۔ اگرچہ دکن کی اسلامی ریاستوں میں عرصہ دراز سے اردو زبان میں عقائد تصوف واخلاقیات اور فقہی کتابوں کے تراجم ہو رہے تھے مگر اردو ترجم قرآن کا آغاز بھی مختلف صورتوں میں شروع ہو چکا تھا۔ یہاں اولیاء اللہ کے آستانوں اور دائروں میں عوامی زبان قدیم اردو جسے ہم دکنی بھی کہتے ہیں رائج تھی اور اس میں یہ اللہ والے' اللہ کا پیام عوام کی زبان میں دیتے رہے۔ اس سلسلہ میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ (گلبرگہ) کے ملفوظات جو آپؒ کے فرزند حضرت سید اکبر حسینیؒ نے جوامع الکلم کے نام سے ترتیب دیئے ہیں ان میں حضرت بندہ نوازؒ کی مجالس کا ذکر ہے اور ان مجالس میں حضرت گیسو درازؒ نے جن جن آیات قرآنی کا ترجمہ دکنی زبان میں کیا ہے اسے تاریخ وار پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح زبانی ترجمہ قرآن کا پتہ چلتا ہے لیکن اردو کی نشو ونما کی ابتداء میں چونکہ ذخیرۂ الفاظ محدود تھا اس لئے ترجمہ قرآن کی طرف علماء نے قدم نہ اٹھایا۔ اردو کے ابتدائی ادوار میں بھی مختلف تراجم ملتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی مکمل قرآن کا ترجمہ نہیں ہوا۔

قرآن مجید کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ قرآن مجید کے اردو ترجمہ کرنے والوں کا اصل مقصد یہی رہا ہے کہ قرآنی مطالب ومفاہیم کو ان لوگوں تک پہنچایا جائے جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے۔ پھر اس مقصد کے ساتھ ساتھ ان کا اس بات پر بھی زور رہا ہے کہ عوام کو آسان اور عام فہم پیرایہ میں قرآنی احکامات اور تعلیمات پہنچائی جائیں تاکہ انہیں دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اس دوران زبان اردو میں نثر کے اسالیب تبدیل ہوتے رہے جس کا اثر قرآن کے اردو تراجم پر

بھی ہوا۔

دکنی دراصل اردو کی ابتدائی شکل ہے۔ دکن میں عام بول چال کی زبان رہی۔قرآن مجید کے اردو ترجمہ کے علاوہ دکنی میں کئی نظمیں ونثر موجود ہیں۔ اردو تراجم قرآن کی ابتداء دکن سے ہوئی لیکن اب تک کی گئی تحقیقات کے مطابق دکن میں کئے گئے تراجم قرآن نامکمل رہے ہیں یعنی یہ قرآن کریم کے چند پاروں' سوروں تک محدود تھے پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم کے اردو تراجم کی ابتداء دکن سے ہوئی۔ ڈاکٹرعبدالحق نے قرآن شریف کے اردو تراجم میں سورہ یوسف کے گجراتی اردو ترجمہ کو سب سے زیادہ قدیم قرار دیا ہے۔

قرآن مجید کے اردو تراجم پر پہلی مرتبہ باضابطہ دکن میں توجہ دی گئی۔اس طرح اردو زبان میں پہلی مرتبہ قرآن مجید کا ترجمہ 1222ھ میں مولوی عزیز اللہ ہمرنگ اورنگ آبادی (دکن) کا دستیاب ہے۔اس کا نام چراغ ابدی ہے۔لیکن یہ صرف قرآن مجید کے 30ویں پارہ کا ہی ترجمہ ہے۔

صاحب تاریخ قرآن حکم عبدالصمد صارم کے مطابق:

قرآن شریف کا سب سے پہلا اردو ترجمہ حکیم شریف خان دہلوی متوفی 1222ھ کا ہے لیکن یہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ان کے خاندان میں یہ بشکل مخطوطہ موجود ہے۔ .....(بحوالہ تاریخ قرآن۔صفحہ 126)

اس طرح پتہ چلتا ہے کہ ہمرنگ اورنگ آبادی اور حکیم شریف خان دہلوی نے ایک ہی زمانہ میں قرآن مجید کے اردو تراجم پر توجہ دی۔اس سے ظاہر ہے کہ تراجم کی ابتداء کے معاملہ میں دکن' شمالی ہند کے ہم شانہ رہا۔اب یہ قرآن مجید کا مکمل اردو ترجمہ شاہ محمد رفیع الدین دہلوی (م1233ھ 1817ء) نے کیا۔ انہوں نے اردو زبان میں مکمل لفظی ترجمہ قرآن 1200ھ میں مکمل کیا جب کہ ان ہی کے بھائی شاہ محمد عبدالقادر دہلوی (م1230ھ مطابق 1814ء) نے اردو زبان کی تاریخ کا پہلا مکمل بامحاورہ ترجمہ قرآن 1205ھ 1790ء میں مکمل کیا ۔ یہ دونوں تراجم قرآن تیرھویں صدی ہجری ہی میں شائع ہونا شروع ہوگئے جس کے باعث ان کو اولیت کے ساتھ ساتھ پذیرائی بھی حاصل ہوئی اگرچہ تاریخ میں ان دونوں اردو تراجم قرآن سے قبل کے بھی تراجم پائے جاتے ہیں لیکن یا تو وہ مکمل ترجمہ قرآن نہیں تھے یا مخطوطہ ضائع ہوگئے۔اس لحاظ سے ان دونوں بھائیوں کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ ایک لفظی ترجمہ قرآن کا بانی ہے تو دوسرا بامحاورہ ترجمہ قرآن کا حامل۔

قرآن کریم کا کونسا ترجمہ سب سے قدیم ہے' کون ثانوی حیثیت کا حامل ہے' کون کس سے استفادہ کرتا ہے' یہ تفصیل جاننا مشکل ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ دستیاب قرآن تراجم کا تعلق دکن سے ہے یعنی قرآن مجید کے تراجم کی ابتداء تو دکن سے شروع ہوتی ہے۔اس سلسلہ میں سب سے اولین ترجمہ گجرات اردو میں دستیاب ہے۔ ڈاکٹرعبدالحق کے مطابق:

''اس قسم کی سب سے قدیم کتاب جو مجھے دستیاب ہوئی ہے وہ پرانی گجراتی زبان میں ہے۔افسوس کے یہ اول وآخر ناقص ہے۔ اس لیے مصنف اور سن تصنیف کا پتہ چلانا غیر ممکن ہے۔ البتہ زبان کے ڈھنگ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دسویں صدی کے اواخر یا گیارھویں صدی کے اوائل کی تالیف ہے کیونکہ اس کی زبان ''یوسف زلیخا'' سنہ 1109ھ میں لکھی گئی اور یہ یقیناً اس سے پہلے کی ہے۔ یہ سورہ یوسف کی تفسیر ہے۔''.....قدیم اردو' ڈاکٹر عبدالحق' صفحہ 122

اس کے علاوہ قدیم دکنی زبان میں قرآن مجید کے مکمل ترجمہ کے بجائے مختلف سورتوں کا تراجم بھی ملتے ہیں۔ جیسا سورہ ھود' عم یتسآء لون' سورہ رحمٰن' سورہ یٰسین بھی موجود ہیں۔

ڈاکٹر حمید شطاری کے بموجب قدیم دکنی میں پارہ عم کی ایک تفسیر بھی دستیاب ہے۔ یہ ترجمہ وتفسیر سورہ نباء سے شروع ہوکر وَالنّاس پر ختم ہوتی ہے۔ بعد میں سورہ فاتحہ کی تفسیر موجود ہے۔ چونکہ اس تفسیر پر نہ مقدمہ موجود ہے اور نہ ہی ترقیمہ۔ اس طرح مترجم کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ تاہم اس نسخہ کا نام 'تفسیر قرآن مجید' ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ قرآن مجید کی مکمل تفسیر ہو۔ تاہم'' پارہ عم'' کا ہی نسخہ دریافت ہے جس کا مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔

حیدرآباد کے ایک عالم دین سید بابا قادری (ابن سید شاہ محمد یوسف قادری) نے 1240ھ میں ''فوائد البدیہیہ'' کے نام سے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کا نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ قادری صاحب نے اس ترجمہ قرآن کا مقدمہ بزبان فارسی تحریر کیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے کام کی تکمیل ماہ ذیقعدہ 1240 ہجری میں انجام دی ہے۔ مقدمہ کے مطابق ''فوائد البدیہیہ'' کا تکمیلہ بہ عہد نواب سکندر جاہ بہادر عمل میں آیا۔ دراصل ''فوائد البدیہیہ'' میں ترجمہ زیادہ ہے آیات سے متعلق تفصیل بہت ہی مختصر ہے۔ مولف نے مقدمہ میں ''فوائد البدیہیہ'' کی زبان کو ہندی قرار دیا ہے۔ تاہم ڈاکٹر حمید شطاری کے بموجب بابا قادری کی تفسیر کا نام ''تفسیر تنزیل'' بھی بتایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بموجب اس تفسیر کے 5 نسخہ موجود ہیں جو کتب خانہ سالار جنگ، ادارہ ادبیات اردو اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق نے اپنی کتاب قدیم اردو میں بابا قادری کے ترجمہ کا نمونہ پیش کیا ہے۔ سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے:

''(ذالک الکتاب) یہ کتاب یعنی قرآن شریف (لاریب فیہ) نہیں شک ہے بیچ اس کتاب کے۔ اس کتاب کے نازل ہونے کا سبب یہ ہے کہ مالک ابن ضیف یہودی تھا' مسلمانوں کے دلوں میں شک ڈالتا تھا کہ یہ کلام اللہ وہ کتاب نہیں ہے کہ جس کے نازل کرنے کا وعدہ خدائے تعالیٰ نے توریت میں کیا تھا۔ (ہدی للمتقین الذین) ہدایت کرنے کا بارا ہے یہ کلام اللہ واسطے پرہیزگاروں کیا ایسے پرہیزگاروں (یومنون بالغیب) ایمان لاتے ہیں وہ لوگ ساتھ غیب کے یعنی جو چیز کہ نہیں دیکھی جیسا کہ جنت اور دوزخ

اورسوائے اس کے۔

اسی طرح قدیم دکھنی اردو میں قرآن شریف کے تراجم ملتے ہیں جس میں سورہ یوسف کا ترجمہ وتفسیر،تفسیر حسینی،تفسیر قرآن مجید ازسورۂ مریم تا آخرمعہ چہل حدیث وغیرہ شامل ہیں۔

اس دور میں دکن میں اس اہم تفسیر ''تفسیر قادری'' ہے جو'کشف القلوب' کے نام سے بھی دکن میں مشہور ہے۔اس ترجمہ قرآن اور تفسیر کو مولانا محمد عمرالحسینی نے اس کی شروعات کی تھی۔ وہ ایک جید حافظ قرآن'سبعہ عشر کے قاری' قادرالکلام شاعر'عالم دین وصاحب طریقت بزرگ رہے ہیں۔ آپ مکہ مسجد حیدرآباد میں بعدنماز جمعہ درس قران دیا کرتے تھے۔درس جب 14 پاروں تک پہنچا تو بعض اصحاب کی ترغیب پرانہوں اپنی تفسیر کولکھنا شروع کردیا۔اوراپنے انتقال تک انہوں نے سورہ فتح تک ترجمہ وتفسیر کیا'بعدمیں ان کے فرزندسید محمد بادشاہ حسینی کی قیادت میں ماباقی ترجمہ وتفسیر کی تکمیل کی گئی۔ بعد تکمیل تفسیرقادری کا نام تفسیرکشف القلوب 1319ھ رکھا گیا۔ اس کے سرورق پر'' تفسیرقادری المعروف بہ اسم تاریخی تفسیر کشف القلوب'' لکھا ہے۔ مولانا حسینی نے تفسیر قادری کے مقدمہ ترجمہ کی حکمت عملی بھی بیان کی ہے۔ اپنے ترجمہ قرآن کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''اس میں ترجمے کی طرف پہلے توجہ کی گئی اور جہاں تک ہوسکا محاورہ اورالفاظ دونوں کا خیال رکھا گیا لیکن عربی زبان اس قدروسیع ہے کہ ترجمہ کے لیے اردو زبان میں الفاظ نہیں ملتے۔ پھر کلام الٰہی جومعدن فصاحت وبلاغت ہے'اس کا ترجمہ اسی طرح ہے گویا حسین آدمی کی تصویر کہ صورت تو ہے لیکن جان نہیں۔آدمی کے لیے جس طرح جان ہے کلام کے لیے فصاحت وبلاغت ہے۔ پھر بلاغت بھی وہ کہ تمام فصحائے عرب سے اسی کلام عربی میں ادا نہ ہوسکی تو ترجمہ میں وہ بلاغت کس طرح باقی رہے گی۔ چنانچہ آیت سورہ نمل کو دیکھو!(جہاں اب ہم تفسیر لکھتے لکھتے پہنچے ہیں)وہ یہ ہے''وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ ''اب ہم نباء کا ترجمہ سوائے خبر کے اور کیا کرسکتے ہیں' پہلے وہ صفت بدیع جو سباء ونباء میں ہے فوت ہوگئی اور وہ فواصل کا لطف جو پہلی آیت میں الغائبین دوسری میں بین اسی آیت میں یقین ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتارہا کیونکہ ہم ترجمہ غیریقینی یا یقینی خبر کریں گے۔اس کے علاوہ نباء کے معنی ایسی خبر کے ہیں جو باوقعت اور شاندار ہو یہ جن پرحسن ہے اب ترجمے میں اگرخبر کے ساتھ باوقعت اورشاندار بڑھا جائے تو علاوہ الفاظ کی زیادتی کے پھر بھی وہ وقعت رہے نہ وہ شان۔یہی سبب ہے کہ ہرمترجم نے اپنے ترجمے میں بہت ہی کوشش کی ۔بعض لوگوں نے لفظی ترجمہ اختیار کیا' وہ اس بات پرخوش ہیں کہ ہم نے تو کچھ کم وبیشی نہ کی جس طرح کا اسی طرح کا ترجمہ کردیا لیکن فصاحت کا خیال ضرور تھا اوربعض اشخاص نے بامحاورہ ترجمہ کیا اور لفظ کا خیال نہ رکھا۔لیکن الفاظ کا خیال رکھنا بھی ضروری تھا۔ پھران الفاظ کی زیادتی میں کوئی میں کوئی نہ کوئی سبب ہے

چنانچہ ہم نے اسے مواقع پر اپنے ترجمے میں تصریح کی ہے۔ اسی طرح کوئی مخدوفات ومقدرات وبطور تفسیر جوا لفاظ ہوں وہ بین القوسین لکھ کر اکثر جگہ اس کا ماخذ بھی حاشیہ میں لکھ دیا ہے۔غرض لفظ ومعنی دونوں کا خیال رکھ کر ترجمہ کیا گیا ہے۔لیکن جہاں ہمارا محاورہ لفظوں کے مطابق نہ ہوا تو اس وقت میں بہت دشواری پیش آئی ہے۔ آخرتحری (بہتری ڈھونڈنا) سے جس جانب ترجیح معلوم ہوئی اسی کو اختیار کیا اور تفاسیر معتبرہ سے بہت چھان بین کی گئی۔ پھر بھی جو غلطی صادر ہوگئی تو ناظرین تفسیر سے امید ہے کہ اس سے آگاہ فرمائیں۔تامستقل طور پر ترجمہ چھپنے کے وقت اس کی رعات رکھی جائے اور اسی کا نام تفسیر قادری اور تاریخی نام کشف القلوب رکھا گیا ہے جس کے عدد 1319 ہوتے ہیں۔اب سنہ 1324 شروع ہے اسی پانچ سال میں پانچ پارے ہوئے۔''

.....مقدمہ تفسیر قادری' مطبوعہ حیدرآباد

یہ ترجمہ وتفسیر پہلی مرتبہ حیدرآباد ہی میں 1319ھ میں طبع ہوکر منظرِ عام پر آئی۔

حیدرآباد دکن سے تعلق رکھنے والے دیگر معروف اورممتاز تراجم قرآن وتفاسیر قرآن میں مولانا عبدالقدیر حسرت کا ترجمہ وتفسیر قرآن' مولانا قطب الدین صاحب کی تفسیر قطبی اور مولانا عبدالباری کا مشہور ترجمہ قرآن موجود ہیں۔ یہ تفاسیر وتراجم برسوں سے حیدرآبادیوں کے گھرانوں میں بھی موجود رہی ہیں۔اس کے علاوہ دکن میں کئی اور تراجم قرآن اور تفاسیر لکھی گئی ،جن میں کئی شائع بھی نہ ہوسکیں۔اگر شائع بھی ہوئی ہیں تو جزوی طور پر چند پارے یا کچھ حصہ ہی شائع ہوسکا۔اس طرح کے قرآن مجید تراجم وتفاسیر میں راقم الحروف کو دوتراجم وتفاسیر دستیاب ہوئے جن میں علامہ رشدی صاحب کی تفسیر رشدی اور علامہ سعادت اللہ خان صاحب ہوش مندوزئی کی تفسیر 'سعادت البیان' بھی شامل ہے۔

حیدرآباد کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ یہاں کی ایک خاتون عالمہ نے قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر کا بارگراں اٹھایا ہے۔حیدآبادی خاتون محترمہ محمود النساء بیگم (متوفی 1965ء) نے ''آسان ترجمہ وتفسیر' کے نام سے بزبان اردو قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر انجام دی ہیں۔جاریہ سال 2017ء میں اسی تفسیر کو جدید انداز میں شائع کیا گیا ہے۔تاہم حیدرآباد میں کئے گئے قرآن مجید کے اردو تراجم میں دو ناموں نے ملک گیر شہرت اختیار کی ان میں نواب وحید الزماں کی تفسیر اور دوسرے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا پرچہ ترجمان القران ہیں۔

مولوی نواب وحیدالزماں:

مولوی وحید الزماں فاروقی کا نپور میں 1850ء میں پیدا ہوئے لیکن حیدرآباد میں مقیم ہوگئے۔انہوں نے ایک سو سے زیادہ کتب تحریر کئے۔حیدرآباد میں ہی موضح القران کے نام سے قرآن مجید کا ترجمہ بھی شامل ہے۔انہوں نے تفسیر وحیدی کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر بھی کی۔مولوی وحیدالزماں کے ترجمہ قرآن میں جدید خیالات وافکار پائے جاتے ہیں اور ترجمہ قرآن کرتے وقت اکثر مقامات پر

مطالعات ترجمہ سے متعلق ایک نظریہ ''مداخلت'' کو استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ابوالاعلیٰ مودودی:

صاحب 'تفہیم القرآن' ابوالاعلیٰ مودودی اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے اور حیدرآباد میں پرورش پائی۔ آخری عمر میں پاکستان منتقل ہوگئے۔ حیدرآباد دکن سے 1932ء میں رسالہ ترجمان القرآن جاری کیا۔ مودودی صاحب نے نہایت آسان اور سادہ اسلوب میں ترجمہ قرآن اور تفسیر لکھی ہے جو ایک کم علم انسان کے لئے عام فہم ہے۔ انہوں نے اس کا نام تفہیم القرآن رکھا۔ تفہیم القرآن کے مقدمہ میں وہ رقمطراز ہیں کہ میں نے اس قرآن کے الفاظ کو اردو جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے، اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کردوں۔ مودودی صاحب نے قرآن کے اسلوب کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی سعی کی ابتداء کی۔ انہوں نے اپنے ترجمہ کو لفظی پابندیوں کے بجائے قرآنی آیات میں موجود پیام کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اردو میں لفظی پابندیوں سے آگے بڑھ کر قرآن کریم کے مطالب کو پیش کرنے کی کاوش کا تفہیم القرآن کے مقدمہ میں اعتراف کرتے ہیں۔ رقمطراز ہیں کہ:

اس طرح کے آزاد ترجمے کے لئے یہ تو بہرحال ناگزیر تھا کہ لفظی پابندیوں سے نکل کر ان کے مطالب کی جسارت کی جائے لیکن معاملہ کلامِ الٰہی کا تھا اسی لئے میں نے بہت ڈرتے ڈرتے ہی یہ آزادی برتی ہے"۔ (تفہیم القرآن، ج:1، دیباچہ، ص:11)

مودودی صاحب خود کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے آیات قرآنی یا الفاظ قرآنی کے جو معنی ومطالب ان کی سمجھ میں آئے اور ان کے دل ودماغ پر جس بات فہم کا ادراک انہیں ہوا ہے اس ضبط تحریر میں لایا ہے۔ اسی لیے انہوں نے قرآن مجید کے اس ترجمہ کو 'تفہیم' کا نام دیا ہے۔ بہرحال مودودی صاحب کی اس کاوش کی بہت پذیرائی ہوئی۔ عام آدمیوں نے اس سے استفادہ حاصل کیا۔

حواشی:

تاریخ قرآن حکیم' عبدالصمد صارم

'قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر کا تنقیدی مطالعہ

1914ء تک' ڈاکٹر سید حمید شطاری

تفہیم القرآن' ابوالاعلیٰ مودودی

قدیم اردو' ڈاکٹر عبدالحق' صفحہ 122

مقدمہ تفسیر قادری' مطبوعہ حیدرآباد

تفسیر رشدی' حیدرآباد

تفسیر سعادت البیان'

تفسیر قدیری

تفسیر قطبی

☆☆☆

سعدیہ سلیم
لیکچرر اُردو
سینٹ جانس کالج، آگرہ، اُتر پردیش

اُردو کی منتخب خواتین قلم کار: ایک اجمالی جائزہ

عورت کے ساز ہستی نے مختلف راگ چھیڑے، کبھی ایک معشوقہ بن کر اس نے ایوان سخن کی شمع فروزاں کی اور کبھی ایک محبوبہ بن کر داستانوں میں سوز و ساز، درد و داغ، جستجو و آرزو روشن کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر عورت نہ ہوتی تو آرٹ بے رنگ، شاعری بے کیف اور ادب پھیکا ہوتا۔ اگر چہ برصغیر کے سماجی نظام میں یہ گنجائش بہت کم تھی کہ خواتین تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کر سکیں پھر بھی اس صدی کے دوران خواتین نے جو ادب تخلیق کیا وہ اُردو ادب کے ورثے میں بہت اہم اور باوقار اضافہ ہے اور اسے نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ اس صدی کی ابتداء سے خواتین نے تعلیمی اور تخلیقی سرگرمیوں میں باقاعدہ حصہ لینا شروع کیا۔ لاہور سے محمدی بیگم (والدہ امتیاز علی تاج) نے ''رسالہ تہذیب نسواں'' نکالا۔ اس کا پہلا شمارہ یکم جولائی 1898ء کو منظرِ عام پر آیا۔ 1904ء میں علی گڑھ سے ماہنامہ ''خاتون'' جاری کیا۔ یہ ماہنامہ شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم نے جاری کیا۔ یہ وہی شیخ عبداللہ اور بیگم عبداللہ ہیں جو لڑکیوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے اور انہوں نے تعلیم نسواں کو آگے بڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا یہ رسائل وہ معتبر حوالے ہیں جس سے ابتدائی دور کی خواتین کی تخلیقات اور ان کے فکر و شعور کا پتہ چلتا ہے۔ ان لکھنے والیوں میں نذر سجاد حیدر، صغریٰ ہمایوں، فاطمہ بیگم، بیگم اختر اور بلقیس جہاں جیسی شاعرہ شامل ہیں۔

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

یوں تو طبقہ نسواں کی تعلیم و تربیت اور بیداری کی غرض سے خواتین ناول نگاروں کا ایک کارواں اُردو ادب میں موجود رہا ہے۔ اردو کی پہلی خاتون ناول نگار ''رشیدہ النساء'' ہیں جنہوں نے 1881 میں ناول ''اصلاح النساء'' لکھا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد اور اس دور کے دیگر ناول نگاروں کی طرز پر لکھا ہوا یہ ناول ان کے صاحب زادے محمد سلیمان نے 1949ء میں شائع کیا۔ رشیدہ النسا کے ناول ''اصلاحِ نسواں'' سے جو سلسلہ شروع ہوا وہ اکبری بیگم، طیبہ بیگم، عباسی بیگم، رضیہ بانو، محمدی بیگم، نذر سجاد حیدر اور صغریٰ ہمایوں تک پہنچتا ہے اس لئے اس دور کی خواتین ناول نگاروں کے فکر و مشاہدات گھر کی چہار دیواری سے نکل کر معاشرتی زندگی کے گونہ گوں اور پیچیدہ مسائل کو اپنی گرفت میں لیتے نظر آتے ہیں۔ حجاب امتیاز علی، صالحہ عابد حسین، رضیہ

سجاد ظہیر، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر بعض ایسی ناول نگار ہیں جن کے یہاں عورت گھر کی چہار دیواری سے آگے تک کا سفر طے کرتی نظر آتی ہے۔

حجاب امتیاز علی کے نسوانی کردار جدید فکری تہذیب کے علمبردار ہونے کے باوجود سماجی بندشوں میں جکڑے ہیں البتہ صالحہ عابد حسین اور رضیہ سجاد ظہیر کے یہاں مشرق ومغرب ایک دوسرے سے متصادم نظر آتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی خاص بات یہ ہے کہ سماجی مسائل اور سیاسی تحریکات کا شعور آگہی بھی ان کے یہاں واضح طور پر اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ صالحہ عابد حسین کے ناول ''عزرا'' میں اس کی ہیروئن کے جذبات ملاحظہ فرمایئے جو جیل جاتے ہوئے شوہر سے مخاطب ہے۔

''میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ تم زمانہ دیکھ کر یا معافی مانگ کر قید کی مصیبت سے چھوٹ جاؤ یہ تو بہت بڑا اعزاز ہے جسے خدا نے خدمت کا اور قربانی کا موقع دیا وہ کیوں نہ کرے تم جیل جارہے ہو بڑی خوشی سے سدھارو مگر اس بات کی اجازت دیتے جاؤ کہ تمہاری عزرا بھی تمہارے پیچھے پیچھے وہاں آجائے۔''

(صالحہ عابد حسین ''عزرا'' ماڈرن پبلک ہاؤس، نئی دہلی)

بیسویں صدی کے وسط میں خواتین ناول نگاروں نے وہ معرکہ انجام دیا کہ اردو ادب کی تاریخ ان کے ناول اور افسانوں کے حوالے کے بغیر لکھنا ممکن نہیں رہا۔ عصمت چغتائی کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' اور قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' اردو کے اہم ترین فن پاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے بیگم نذر سجاد حیدر اور بیگم حجاب امتیاز علی تاج کی تحریریں پڑھنے والوں کی توجہ حاصل کرچکی ہیں۔ مگر عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں نے قارئین اور ناقدین پر مطالعے کے نئے باب کھولے۔

رضیہ سجاد ظہیر کے یہاں ترقی پسندانہ نقطہ نظر ملتا ہے جو عصمت چغتائی کے یہاں پوری بے باکی سے کھل کر سامنے آتا ہے۔ عصمت چغتائی ہندوستان کی ایک مشہور مصنفہ جنہوں نے افسانہ نگاری خاکہ نگاری اور ناول نگاری میں نام پیدا کیا۔ اتر پردیش میں پیدا ہوئیں واجدہ تبسم اور قرۃ العین حیدر کی طرح عصمت چغتائی نے بھی اُردو ادب میں انقلاب پیدا کردیا۔ عصمت چغتائی نے خواتین اور ان سے جڑے مسائل پر لکھا ہے ان کے افسانے اور ناول متوسط طبقے کی خواتین کی نمائندگی کرتے ہیں ان کا پہلا افسانہ ''گیندہ'' ہے اس افسانے میں انہوں نے کئی اہم موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ عصمت چغتائی ترقی پسند ادب سے وابستہ تھیں۔ ترقی پسند ادب کے بارے میں انہوں نے کہا ہے۔

''ایسا ادب جو انسان کی ترقی چاہے انسان کی بھلائی چاہے، وہ ادب وہ آرٹ جو انسان کو پیچھے نہ ڈھکیلے انسان کو دنیا کی اچھی سمت پر چلائے وہ ادب جو انسان کو صحت، علم اور کلچر حاصل کرنے میں مدد دے اور جو ہر انسان کو برابر کا حق دینے پر یقین رکھتا ہو انسان کی زندگی کے عروج کا قائل ہو انسان کو گندگی سے نکال کر صاف وشفاف

علم کی طرف پہنچا دے۔''

عصمت چغتائی کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' اور افسانہ ''لحاف'' نسائی اظہار کی بہت واضح مثال ہے۔ٹیڑھی لکیر میں عصمت چغتائی نے بہت جرائت سے اس نسائی شعور کا اظہار کر دیا ہے جو اس وقت تک نظر انداز ہوتا رہا ہے۔ترقی پسند تحریک خواتین کے لئے خصوصاً افسانہ نگار اور ناول نگار خواتین کے لئے بہت ساز گار ثابت ہوئی جس نے ڈاکٹر رشید جہاں، صدیقہ بیگم سہاروی،عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور جیسی لکھنے والیوں کو سامنے لا کر یہ غلط فہمی دور کر دی کہ خواتین کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتیں۔ قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' ایک ایسا ناول ہے جس میں عورت کے تصور وقت کی مثال پیش کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں میں نسائی شعور کا مکمل ادراک و اظہار ملتا ہے اور کہیں کہیں بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔''اگلے جنم موہے بٹیانہ کی جیو'' اس کی مثال ہے۔

خدیجہ مستور کے ناول '' آنگن'' کی پذیرائی ہوئی۔ان کے فوراً بعد جمیلہ ہاشمی کے ناول ''تلاش بہاراں'' اور ''دشت سوس'' الطاف فاطمہ کا ناول ''دستک نہ دو'' رضیہ فصیح احمد کا ناول ''آبلہ پا'' مقبول ہوئے۔ہاجرہ مسرور، بیگم اختر جمال، نثار عزیز بٹ، خالدہ حسین، فرخندہ لودھی کی تحریروں نے ادبی مقام حاصل کیا۔ بانو قدسیہ اپنے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے ساتھ ادبی افق پر نمودار ہوئیں اور بہت معتبر حوالہ بنیں۔ بانو قدسیہ نے اُردو اور پنجابی زبان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے بہت سے ڈرامے بھی لکھے ان کا سب سے مشہور ناول ''راجہ گدھ'' ہے ان کے ایک ڈرامے ''آدھی بات'' کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔زاہدہ حنا۔رشیدہ رضویہ،فردوس حیدر، نیلم بشیر احمد، نگہت حسن افسانے کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔حال ہی میں فہمیدہ ریاض کی کہانیوں کا مجموعہ ''خط مرموز'' اور عذرا عباس کا مجموعہ ''راستے مجھے بلاتے ہیں'' سامنے آیا ہے جن میں نسائی شعور نمایاں ہے۔ میری کہانیوں کے مجموعے ''کہانیاں گم ہو جاتی ہیں'' کے دیباچے میں ضمیر علی نے ان کہانیوں کو نسائی شعور کی مثال قرار دیا ہے۔

اُردو افسانے کے ارتقائی دور میں جن افسانہ نگاروں نے اپنی انفرادی پہچان قائم کی ہے ان میں حمیدہ سلطان کا نام سرفہرست ہے جہاں بات نسائی ادب کی ہو تو اس کی روایت اور تاریخ تو صدیوں پر محیط ہے۔

قرۃ العین حیدر، صالحہ عابد حسین اور رضیہ سجاد ظہیر کے بعد جن افسانہ نگاروں کا نام خواتین قلم کاروں بلکہ ہندوستان کی منفرد اور مستند ادیبہ کے طور پر لیا جاتا ہے ان میں پہلا نام صغریٰ مہدی کا ہے۔صغریٰ مہدی کی تصانیف ادبی تھیں اسی طرح شمیم نکہت کا شمار بھی معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے افسانوں کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے مسائل کو نہیں بلکہ اپنے ملک اور اپنے سماج کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتی ہیں۔انہوں نے عورت کے ہر روپ کو دیکھا ہے اور اس کے درد کو محسوس کیا ہے اور یہیں سے اپنے کردار

چنے ہیں اپنی کہانیوں کے بارے میں انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے۔

''میں شدت پسند کبھی نہیں رہی لیکن صدیوں سے عورت پر ہونے والے مظالم اور ناانصافیوں کے خلاف میرا قلم ہمیشہ اٹھ جاتا ہے میری کہانیوں کا عام موضوع عورت ہے۔''

اردو ادب کی خاتوں قلم کاروں کی فہرست طویل ہے۔جنوب میں واجدہ تبسم اور جیلانی بانو رفیعہ منظور الامین' قمر جمالی نے ان موضوعات کا احاطہ کیا جو خواتین کے تجربے ہو سکتے ہیں۔

تنقید میں خواتین کا نام صرف ممتاز شریں تک محدود رہ گیا۔ وہ اچھی افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ افسانوی ادب کی بڑی نقاد بھی تھیں۔ منٹو کی کہانیوں کا انہوں نے تفصیل سے تنقیدی جائزہ لیا۔

محبت کی خوشبو شعروں میں سمونے والی پروین شاکر کو ہم سے بچھڑے بیس برس بیت گئے لیکن آج بھی ان کی خوشبو سے سارا عالم مہک رہا ہے اور ان کی شاعری خوشبو کی طرح کو بہ کو پھیلتی چلی جارہی ہے:۔

مر بھی جاؤں تو کہاں، لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

یہ عظیم شاعرہ پروین شاکر 24 نومبر 1952ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ آپ کو اُردو کی منفرد لہجے کی شاعرہ ہونے کی وجہ سے بہت ہی کم عرصے میں وہ شہرت حاصل ہوئی جو بہت ہی کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے. انہوں نے الفاظ اور جذبات کو ایک انوکھے تعلق میں باندھ کر سادہ الفاظ میں نسائی انا، خواہش اور انکار کو شعر کا رنگ دیا۔

بخت سے کوئی شکایت نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے

خاتون شاعرات میں کشور ناہید حمیدہ ریاض وغیرہ نے نسوانی جذبات کی عکاسی کی ہے۔نسائی ادب، اردو ادب کا قابل قدر حصہ رہا ہے۔ یہ خواتین کے ادراک وشعور کی آئینہ دار ہے۔نسائی اظہار کا رویہ تاریخ سے جڑا ہوا ہے۔نسائی ادب وتنقید نہ تو مغرب کی نقالی ہے نہ اس کا کوئی تصادم ہمارے اقدار سے ہے بلکہ یہ ہماری آبادی کے نصف حصے کی ذہنی وفکری سفر کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ یہ خواتین قلم کاروں کا نقطۂ نظر کو پیش کر رہا ہے اور آج ادب میں نقطہ نظر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اردو میں خواتین قلم کاروں کی تخلیقات کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑی عورت یہ باور کرانے میں کامیاب نظر آتی ہے کہ اب وہ باشعور ہے، پڑھی لکھی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے' اس کے لب آزاد ہیں اور اُڑان لا محدود۔ وہ کائنات میں موجود وسیع تر امکانات کو بروئے کار لانے کا ہنر جانتی ہے' امن کی شیدائی ہے' محبت اس کے خمیر میں ہے' ملک کی تعمیر وترقی اور دنیا کو امن وآشتی کا گہوارہ بنانے میں اپنا کردار نبھانا چاہتی ہے۔ اس لئے اخلاق وسماج کی صالح قدروں کی پاسداری کرتے ہوئے عہد نو کی تاریخ لکھنے میں اس کا حصہ ضرور ملنا چاہئے۔

☆☆☆

راسیہ نعیم ہاشمی
ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

16-10-274/9، ریس کورس روڈ
ملک پیٹ، حیدرآباد

خواتین اور صنفی امتیاز

صنف یعنی gender کی اصطلاح چودھویں صدی تک ایک گرامیٹیکل ٹرم کے طور پر استعمال کی جاتی رہی لیکن بیسویں صدی سے یہ لفظ ایک معیار کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے۔ گو صنف (gender) اور جنس (Sex) دونوں ہی کسی شخص کے مرد یا عورت ہونے پر دلالت کرتے ہیں لیکن یہ تھوڑے فرق کے ساتھ استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ جہاں جنس (sex) کا لفظ طبعی فرق کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ وہیں صنف (gender) ثقافتی اور سماجی فرق کی بنیاد پر استعمال میں آتا ہے۔

دنیا کی آدھی آبادی خواتین پر مشتمل ہے۔ مرد اور خواتین دونوں کے وجود اور مساوی کردار سے ایک سماجی ڈھانچہ تشکیل پاتا ہے۔ ایک متوازن اور آزاد معاشرہ اسی وقت تشکیل پاتا ہے جب معاشرے کا نصف حصہ جو خواتین پر مشتمل ہے اسے بھی وہ تمام حقوق میسر ہوں جو ایک مرد کو معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ گذرتے برسوں میں سماجی اور غیر سماجی تحقیق کاروں نے اپنا وقت اور محنت عورتوں کو درپیش مسائل اور خواتین کے مقام میں تبدیلی کے بارے میں جاننے میں صرف کیا ہے۔ جہاں کچھ مصنفین نے شادی، جائداد اور باہری دنیا میں خواتین کے رول جیسے حقوق کا حوالہ دیا ہے وہیں دوسروں نے مردوں کے رویہ اور موجودہ سماجی رسوم و رواج کی بنا پر عورتوں سے روا رکھے جانے والے عدم مساوات اور امتیاز کا حوالہ دیا ہے۔ تقریباً سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ چاہے قانونی طور پر خواتین کو کتنا ہی اونچا رتبہ کیوں نہ دیا گیا ہو، عملی دنیا میں انھیں امتیاز، ہراسانی ہی کا سامنا ہے۔ ان کی رائے جاننے کے معاملہ میں انھیں سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا اور انھیں مردوں کے برابر کا درجہ نہیں دیا جاتا اور نہ ہی انھیں اتنی عزت دی جاتی ہے جس کی وہ حقدار ہیں۔ (Ahuja 1993)

ہندوستانی سماج میں خواتین کے مسائل کئی وجوہات کی بنا پر پیچیدہ ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہندوستانی سماج ایک ہمہ مذہبی، ہمہ لسانی سماج ہے جس میں روایتی اور قبائلی پہلو ہیں (Veena Mazumdar - 1983) خواتین کا بحیثیت صنف نازک انسانی حقوق کے معاملہ میں ہمیشہ سے استحصال کیا جاتا رہا ہے۔ وہ روزِ ازل سے عدم مساوات کا شکار رہی ہیں۔ زاہدہ حنا اپنی تصنیف 'عورت زندگی کا زنداں' میں لکھتی ہیں کہ پہلے پہل

مادرسری نظام تھا۔ زراعت کے دور سے مرد نے زراعت میں حصہ لینا شروع کیا تو بتدریج اس کا تسلط قائم ہوا۔ Fredrich Angles کا کہنا ہے کہ' سماجی پیداور کے دائرہ سے الگ کر دیے جانے کے بعد بیوی گھر کی پہلی خادمہ بنی' آگے وہ لکھتے ہیں' وہ عورت جو کچھ دنوں پہلے تک اپنے' مرد' کے انتخاب میں آزاد تھی اور نسب جس کی ذات سے چلتا تھا جسے گھر خاندان اور قبیلے میں سربراہ کی حیثیت حاصل تھی اب ایک مرد کی ذاتی ملکیت بن گئی۔(Hina-2006)

Universal Declaration of Human Rights میں بھی خواتین کے ساتھ روا رکھی جانی والی تفریق پر اتفاق کیا گیا ہے۔ Universal Declaration of Human Rights اقوام متحدہ کا پہلا دستاویز ہے جس میں خواتین کی برابری کی بات کہی گئی ہے۔

اقوام متحدہ کی جانب سے 18 December 1979 کو Convention for Elimination of All Forms of Discrimination against Women منعقد کیا گیا جس میں حکومت ہند نے موثر کردار نبھایا۔ خواتین کے حالات میں سب سے عظیم تبدیلی Women's convention کی وجہ سے آئی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ نہ صرف خواتین کو مردوں کے مساویانہ حقوق دیے جائیں بلکہ وہ ان حقوق سے مستفید ہونے کی اہل بھی بن سکیں۔

ہندوستان اور خواتین:

ہندوستان میں آزادی کے بعد سے سماجی، معاشی، تعلیمی اور سیاسی میدانوں میں خواتین کی حالتِ زار کافی افسوسناک رہی ہے اس کی وجہ ان کے ساتھ روا رکھی جانے والی ایک صدی پرانی تفریق بھی ہوسکتی ہے۔ جو قدیم ہندوستان میں شروع ہوئی اور medieval India میں اور زیادہ زور پکڑ گئی جس کے نتیجہ میں ستی، بال وواہ، دخترکشی، جہیز اور بے شمار دوسری برائیوں نے جنم لیا۔

ہندوستان پر 200 سال تک انگریزوں نے حکومت کی جن کا اہم مقصد ہندوستان کو کالونی بنا کر اس زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنا تھا' چنانچہ اس دور میں خواتین کے خلاف ان برائیوں کو روکنے کے لئے کوئی ٹھوس اقدامات نہیں کئے گئے لیکن آزادی کے بعد سب سے بڑی جمہوریت کے طور پر اُبھر آنے کے بعد سے ہندوستان میں یہ ایک بڑے مسئلہ کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔

1960 کے دہے میں خواتین کی بہبود سب سے اہم مدہ بنی۔

1970 کے دہے میں بہبود کی جگہ خواتین کی ترقی کے لئے آواز اٹھی۔

1980 کے بعد سے ترقی کی جگہ خواتین کو با اختیار بنانے (women's empowerment) کے نعرے نے لی۔

خواتین کو با اختیار بنانے کے تعلق سے سب سے بڑی

کامیابی 73 اور 74 دستوری ترمیم کی صورت میں سامنے آئی۔ 73 دستوری ترمیم کے تحت local self-governance units کو دستوری مسلمہ حیثیت دی گئی۔ پنچایت اور بلدیہ میں 33 فی صد نشستیں خواتین کے لئے مختص کی گئیں۔ اور انھیں سیاسی اختیارات دیے گئے کہ وہ اپنی صنف کو، سماجی، معاشی ترقی دلانے کی جانب توجہ دے سکیں۔

ہندوستان میں صنفی مسائل:

خواتین اور غربت: Global Monitoring Report 2003 کے مطابق غربت نے لڑکیوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ جس کے نتیجہ میں بچہ مزدوری عام ہوئی ہے۔

تعلیم اور تربیت میں عدم مساوات: خواتین کو با اختیار بنانے کے ضمن میں تعلیم بہت اہمیت رکھتی ہے۔ تعلیم سماجی ترقی کا ایک اہم مظہر ہے۔ 93rd ترمیمی بل ایوان میں پاس ہوئی جس کے نتیجہ میں بچوں کو 6 سے 14 سال تک مفت تعلیم ضروری قرار دی گئی جس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلا کہ لڑکیوں میں dropout کی شرح میں کمی آئی ہے۔ مختلف تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ خواتین کی خواندگی بڑھی ہے۔ شہری علاقوں میں خواندگی کی شرح زیادہ ہے بنسبت دیہی علاقوں کے۔ لیکن تعلیم کے معاملہ میں بہت زیادہ صنفی امتیاز برتا جاتا ہے۔ خواندگی کی شرح، اسکول میں داخلہ اور drop out میں فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔

Public Report on Basic Education in India (PROBE) کے مطابق لڑکیوں کو اسکول بھیجنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی جاتی ہے۔ لڑکیوں کی پرورش میں شادی کا نظریہ اہمیت رکھتا ہے جبکہ لڑکوں کو اسکول بھیجنے کے پیچھے روزگار کا مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ لڑکیوں کے لئے تعلیم کا زیادہ اثاثہ لگانا اس لئے بیکار مانا جاتا ہے کیونکہ آگے جا کر انھیں گھر سنبھالنا ہوتا ہے۔

صحت اور اس سے متعلق سہولیات: مردوں اور عورتوں کے حیاتیاتی فرق کی وجہ سے صحت اور بیماری کے نمونے بھی جدا ہوتے ہیں۔ خواتین زیادہ عمر پاتی ہیں لیکن مردوں کے مقابلہ میں زیادہ بیماریوں اور تناؤ کا شکار ہوتی ہیں۔ مردوں کی life expectancy ہندوستان میں 59.8 ہے جبکہ عورتوں میں 62.7۔ (World health report 2001)۔ کئی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ غذا کے معاملہ میں زیادہ امتیاز نہیں برتا جاتا۔

خواتین کے خلاف مظالم: خواتین کے خلاف ہونے والے مظالم میں جہیز سے متعلق اموات، جنسی ہراسانی، گھریلو تشدد قابل ذکر ہیں۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق ہر ایک گھنٹہ 42 منٹ میں ایک عورت جہیز کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے اور ہر 33 منٹ میں عورت پر مظالم کا ایک واقعہ رونما ہوتا ہے۔ ہندوستان کی تصویر اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ مزید جہیز نہ لانے پر لڑکی کو زندہ جلا دیا گیا۔ شوہر کے اور ساس کے جھگڑے سے تنگ آ کر

خاتون کی خودکشی ۔شوہر کے احکام کی پابجائی نہ کرنے پر بیوی کو طلاق۔ اس طرح کی خبریں ہر روز اخباروں کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ان پر ظلم کرنے والے کبھی طاقتور صنف سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں تو کبھی وہ اپنی ہی صنف والوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنتی ہیں۔

اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق 20 سے 50 فیصد خواتین گھریلو تشدد کا شکار ہوتی ہیں جب کہ ایک اور تحقیق کے مطابق یہ گراف بڑھ کر 50 سے 75 فیصد تک پہنچ جاتا ہے۔مغربی ممالک میں 30 فیصد شادیوں کا انجام طلاق ہوتا ہے اور امریکہ جو خود کو انسانی حقوق کا علمبردار گردانتا ہے وہاں پر طلاق پانے والی خواتین کا فیصد انچالیس ہے۔ ہندوستان میں ہر سال 5000 دلہنیں جہیز کے لیے جلائی جاتی ہیں۔

اقتدار اور فیصلہ سازی میں عدم شمولیت:

1-5-2002 تک ہندوستان بھر میں Supreme Court کے 26 ججوں میں سے 25 مرد اور ایک عورت تھی۔ 1-7-2003 تک آندھرا پردیش میں IAS328 میں سے 290 مرد اور 38 خواتین، 142 فارسٹ آفیسرس میں سے 136 مرد اور 6 خواتین ، 180 مرد IPS اور 9 خواتین تھیں۔

مستقل صنفی امتیاز: خواتین سے تفریق کا ایک واضح اشارہ maternal mortality کی شرح میں اضافہ ہے۔اس کو کم کرنے کے لئے خواتین کو بہتر تغذیہ فراہم کیا جانا ضروری ہے۔ بچے کی پیدائش کو بچی کی پیدائش پر فوقیت دی جاتی ہے۔ sex selective abortions صنفی امتیاز کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ہندوستان میں صنفی امتیاز شمال میں زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستان بھر میں منفی جنسی تناسب کے باوجود ہماچل پردیش، کیرالا، گوا اور ٹامل ناڈو میں خواتین کا جنسی تناسب مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ ہر 1000 مرد کے مقابلہ میں خواتین کا جنسی تناسب ہماچل پردیش میں 1070، کیرالا میں 1068، گوا میں 1019 اور ٹامل ناڈو میں 1000 ہے۔

معاش میں حصہ Work Participation:

ایک سروے کے مطابق unpaid معاشی سرگرمیوں میں مردوں کے مقابلہ میں خواتین کا زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔اور دنیا بھر میں اسی کام کے لئے خواتین مردوں کے مقابلہ میں کافی کم آمدنی حاصل کرتی ہیں۔ (UNDP 1995)۔ خواتین میں poverty driven employment زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔آمدنی میں خواتین کا حصہ بڑھا ہے' کھیتی باڑی اور سمکیات سے ہٹ کر اب چھوٹے اور درمیانی انٹر پری نیئر کے طور پر وہ شامل ہونے لگی ہیں۔ لیکن وہاں بھی مسائل نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے کم تنخواہ، خراب کام کی حالت، صحت اور تحفظ خواتین کے کام کا underestimation جیسے مسائل سے وہ

نبرد آزما ہیں۔

صرف انھیں خواتین کو معاشی طور پر سماج کا حصہ دار مانا جاتا ہے جو paid worker ہیں۔ household یا گھریلو کا لفظ اپنے آپ میں ایک تحقیری صفت بن کر رہ گیا ہے جس کا معاشرے میں کوئی حصہ نہیں۔ حالانکہ عورت اگر non working ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ معاشرے میں اس کا کوئی contribution نہیں۔

ایک عورت جو چولھا چکی کر کے معاشرے کی بنیادی ضرورت کو پورا کرتی ہے، بچے جو مستقبل کے معمار ہوتے ہیں انھیں پروان چڑھاتی ہے، مردارکانِ خاندان کے آرام وضروریات کا خیال رکھ کر انھیں گھریلو ذمہ داریوں سے سبکدوش کرتی ہے تاکہ وہ اپنے حصہ کے کام کو بہتر طور پر کرسکیں اور تیز رفتاری سے ترقی کی سمت گامزن ہوسکیں کیا وہ معاشرے میں کوئی کردار نہیں نبھاتی؟

آج منصوبہ سازوں اور پالیسی سازوں کی سب سے بڑی توجہ اس بات پر ہے کہ خواتین کو کیسے بااختیار بنایا جائے اور سماج میں صنفی عدم مساوات کو کیسے کم کیا جائے۔ اس کے لئے ہندوستان میں کئی قوانین پاس ہوئے ہیں اور خواتین کے لئے کئی اسکیمیں جاری کی گئی ہیں۔ ہم بہت اچھے پالیسی ساز ہیں لیکن مسئلہ ان پالیسیوں کے بہتر نفاذ کے سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر تمام پالیسیز بہتر طور پر نافذ کی جائیں تو صنفی امتیاز کا نام ونشان نہ رہے۔ صنفی مساوات کے لئے راہ ہموار کرنی ہے تو خواتین کی تعلیم کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ تعلیم ہی وہ ہتھیار ہے جس سے لیس ہوکر خواتین مساوی حقوق حاصل کرسکتی ہیں اور تعلیم کی ضیا ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں اور ان کی سوچ سے جھلکے گی۔ مرد وخواتین میں مساوات قائم کرنے کی سعی کے دوران یہ بات ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ یہ عورت اور مرد کے مابین جنگ کا معاملہ نہیں بلکہ دونوں کے باہمی تعاون کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ عورت اور مرد ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ یوں تو یہ ایک گھسی پٹی تشبیہ ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں لھذا زندگی کی گاڑی کو ہموار رکھنے کے لئے دونوں پہیوں alignment نہایت ضروری ہے۔

☆☆☆

مرنے سے پہلے موت کی تیاری کیجئے

☆ کیا آپ نے وصیت نامہ لکھ لیا ہے؟
☆ کیا آپ نے توبہ کرلی ہے؟
☆ کیا آپ نے قرض ادا کردیا ہے؟
☆ کیا آپ نے بیوی کا مہر ادا کردیا ہے؟
☆ کیا آپ نے تمام مالی حقوق ادا کردیئے ہیں؟
☆ کیا آپ نے تمام جانی حقوق ادا کردیئے ہیں؟
☆ کیا آپ کے ذمہ کوئی نماز باقی ہے؟
☆ کیا آپ کے ذمہ کوئی زکوٰۃ باقی ہے؟
☆ کیا آپ کے ذمہ کوئی حج فرض باقی ہے؟

کیا ہم نے کبھی ان چیزوں کے بارے میں سوچا ہے، کبھی جائزہ لیا ہے؟ تیاری تو کرنی ہے۔ موت تو ایک دن آنی ہے۔

امان اللہ
ریسرچ اسکالر

شعبہ تعلیم نسواں
مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، گچی باؤلی حیدرآباد (تلنگانہ)

مطالعاتِ نسواں۔تعارف ضرورت واہمیت

خالق کائنات نے اس دنیا میں وجود انسانی کی تکمیل کے لئے مرد وعورت کی تخلیق کی، ان کو بحیثیت انسان یکساں مقام عطا کیا۔لیکن انسانوں کے خود ساختہ سماجی ڈھانچے نے اس فطری تصور کو مسخ کر کے سماجی توازن کے ناگزیر جز ویعنی عورت کو غیر اہم وکمزور قرار دے کر اسے ہاشیہ پر لگا دیا۔دنیا کے اکثر خطوں میں عموماً خواتین کی حیثیت یہی رہی ہے۔موجودہ عہد ترقی کے عروج کو چھو رہا ہے لیکن اس کے باوجود آج بھی دنیا میں عورت کے ساتھ وہی رویہ روا رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ دوسرے درجہ کے شہری کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔اسے یکساں اور مساوی حقوق میسر نہیں ہیں۔آج عورت محض سامان تسکین اور سامان تجارت بن کر رہ گئی ہے، ہر جگہ استحصال کا شکار ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں خواتین کو ایک شے سمجھا جاتا ہے اس لئے ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔آج کی ترقی یافتہ اور روشن خیال دنیا عورتوں کے حقوق کے تئیں کچھ حد تک سنجیدہ نظر آتی ہے، مختلف قوانین کے ذریعہ ان کے حقوق کی پامالی اور سماج میں پیدا ہونے والے مختلف قسم کے مسائل کو ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن سماج سے یہ برائیاں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہیں، کیوں کہ معاشرے میں خواتین کے تئیں بے جا تعصب اور غلط رویہ موجود ہے، ان کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں اور سماج میں رہنے والے افراد کی سوچ اور نظریہ بالکل تبدیل ہو چکا ہے وہ خود کو حاکم اور عورت کو محکوم تصور کرتے ہیں جس کی بنا پر وہ خواتین پر ظلم وزیادتی کرتے ہیں۔انہیں برائیوں کے بدولت مطالعات نسواں کا تعارف ہوا اور سماج میں تبدیلی لانے کے تصور نے مطالعات نسواں پروگرام کی بنیاد ڈالی۔ بنیادی طور پر مطالعات نسواں خواتین کے مسائل اور ان کے حل کے مطالعہ جات کا میدان ہے جس کا مقصد خواتین کے مقام کو بہتر بنا کر ان کی ترقی کے لئے حکمت عملی کی تجاویز فراہم کرنا ہے۔

یہ مضمون ڈاکٹر آمنہ تحسین کی کتاب ''مطالعات نسواں'' کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے۔ڈاکٹر آمنہ تحسین کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں وہ ایک مشہور ومعروف خاتون ہیں جو مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے شعبۂ تعلیم نسواں میں بحیثیت استاد اور مرکز برائے مطالعات

نسواں میں بحیثیت ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ان کی مصروفیت کے اور بھی میدان ہیں جن میں سے اردو زبان میں کتابیں تحریر کرنا خاص اہمیت کا حامل ہے۔ان کا اردو زبان میں کتاب تحریر کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اردو میں مطالعہ کرنے والے طلباء کو آسانی ہوتا کہ وہ بہترین اور صحیح معلومات سے واقف ہوں اور زیادہ سے زیادہ افراد اس سے مستفید ہوسکیں۔

ابھی گزشتہ دنوں حیدرآباد میں اردو کا نسائی ادب کے نام سے بھی ایک مفید کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کی تھی جو بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کے مضمون و کہانیاں لکھنے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔

آج ہمارے معاشرے میں خواتین کی حیثیت بہت ہی بدتر ہے اور صدیوں سے ان کو اپنی زندگی میں بے شمار مسائل درپیش آتے ہیں۔مطالعات نسواں ایک ایسا پروگرام اور ایک ایسی فکر ہے جو خواتین کی بہتری کے لئے کوشاں ہے جس کو ذہن میں رکھ کر ڈاکٹر آمنہ تحسین نے مختلف کتابوں، رپورٹوں اور انٹرنیٹ سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے اپنی سوچ وخیال کو کتاب کی شکل دے کر عملی جامہ پہنایا۔ جو مطالعات نسواں کے نام سے مشہور ہے۔اگر کچھ یوں کہا جائے کہ اردو زبان میں یہ کتاب "مطالعات نسواں" کے میدان میں اساسی حیثیت رکھتی ہے تو بالکل غلط نہ ہوگا کیوں کہ مطالعات نسواں سے متعلق اردو زبان میں کتابیں نہ کے مساوی ہیں۔مصنفہ نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جو مختلف ابواب پر مشتمل ہیں۔اس کے علاوہ حرف چند، پیش لفظ، ابتدائیہ اور اختتامیہ بھی ہے۔کتاب کی ضخامت محض 272 صفحات کے قریب ہے۔اس کتاب میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں غیر ضروری باتوں سے پرہیز کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے اس کتاب کو ان افراد کے نام کیا ہے جنھوں نے حقوق نسواں کے حصول میں اپنی زندگیاں نثار کردیں۔

حصہ الف۔خواتین اور سماج (تاریخی تناظر میں) جس کا اولین باب۔عالمی سماج میں عورت کی حیثیت ہے اس باب میں عالمی سماج میں رہنے والی عورت کی حیثیت کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرا باب۔ ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت کے نام سے ہے جس میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ غیر ملکوں کی طرح ہمارے ملک ہندوستان میں بھی خواتین کی صورت حال دنیا کے دوسرے خطوں کے مقابلے میں بہتر نہیں ہے۔ یہاں پر بھی خواتین کو مختلف مسائل درپیش آتے ہیں، آئے دن وہ مختلف قسم کی زیادتیوں کا شکار ہوتی رہتی ہیں، خوف کے سائے میں زندگی گزارتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی گراں قدر صلاحیت و قابلیت خوابیدہ ہی رہ جاتی ہے، سماجی و معاشی مقام حاصل نہیں ہو پاتا جس سے وہ آزادانہ اور خود کفالتی زندگی بسر کرسکیں۔

تیسرا باب۔ ہندوستانی مذاہب اور خواتین کے نام سے موسوم ہے۔جس میں مختلف مذاہب میں خواتین کی

موجودہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔خواتین پر صدیوں سے ہورہے ظلم وتشدد نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ خواتین کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں ان کے ساتھ ظلم وتشدد ،استحصال اور صنفی امتیاز وغیرہ ایک عام بات ہے۔اس باب میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خواتین خواہ وہ کسی بھی مذہب کی ہوں ان کو ثانوی درجہ دیا گیا ہے اور ان کو چار دیواری کے اندر قید کر کے انہیں ان کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔

حصہ ب۔ خواتین کا بدلتا موقف (تانیثی نظریات اور تانیثی تحریکیں)

اولین باب ۔تانیثیت ہے۔جس میں تانیثیت کی تعریف مختلف طریقوں سے پیش کی گئی ہے اور اس کے مفہوم کی وضاحت بہترین انداز میں کی گئی ہے ۔جیسے تانیثیت ایک اصطلاح ہے جو لاطینی لفظ Femina سے مشتق ہے اس کا بنیادی مفہوم نسوانی خصوصیات رکھنا ہے۔ مصنفہ نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "تانیثیت کی کوئی تعرف متعین نہیں ہے۔جو ہر دور اور ہر ملک کی خواتین پر منطبق کی جا سکے "(ص۔95-94) اور اس میں تانیثیت کی لہروں وان سے متعلق فکر کو بھی بیان کیا گیا ہے ۔مصنفہ نے اس باب میں لکھا ہے کہ تانیثیت کی پہلی لہر مساوات سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری لہر کا پہلا نکتہ تولید کی سیاست ہے جو 1960 کے بعد سے تصور کی جاتی ہے۔تانیثیت کی تیسری لہر کی شروعات کو 1990 کے آس پاس تسلیم کیا جاتا ہے اس میں صنف اور حسیت کو بنیادی نکتہ بنایا گیا ہے۔

دوسرا باب ۔تانیثیت کے بنیادی تصورات پر محیط ہے۔جس میں بتایا گیا ہے کہ تانیثیت کے تصور کی شروعات مرد کا جبر،جنس کی بنیاد پر عورتوں کی ثانوی حیثیت، صنفی تفرقہ ،استحصالی رشتے ،ظلم،حق و وراثت،شخصی آزادی کے محرکات سے ہوئی۔خواتین نے اپنی حیثیت کے متعلق بہت سے سوالات بھی کیے۔مصنفہ نے اس باب میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اقوام عالم میں عورت اور مرد کو جنس کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اسی تقسیم کی بنا پر سماج نے انہیں مخصوص کردار سے نوازا ہے جس کی وجہ سے خواتین سیاسی ،سماجی ،معاشی اور تہذیبی اعتبار سے ہر جگہ کم رتبہ وکم تر نظر آتی ہے ۔ان کے مطابق سماج نے مردوں کو اعلی اور عورتوں کو ادنی مقام دیا ہے انہوں نے کہا کہ جب تک سماج سے یہ برائیاں ختم نہیں ہوں گی تب تک خواتین کو اس کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔اس باب میں پدرشاہی نظام کو عورتوں کی خراب حیثیت کا ذمہ دار بتایا گیا ہے ۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین صاحبہ لکھتی ہیں کہ "عام طور پر پدرشاہی نظام مردوں کی معاشرتی بالا دستی کو کہتے ہیں۔جس کی بنیاد سماج ،خاندان ،سیاست ،معیشت اور مذہب پر مردوں کی اجارہ داری ہے۔اس میں مرد کو حاکمیت اور عورت کو ماتحت کا موقف حاصل رہتا ہے"۔(ص۔106-105)

اس باب میں پدرشاہی نظام کا کنٹرول،سماجی اداروں میں پدرشاہی نظام ،خاندان ،مذہب،قانون ، معاشی سسٹم اور معاشی ادارے ،سیاسی نظم و ادارے ، میڈیا،تعلیمی ادارے ومعلومات کا نظام،عورتوں پر تشدد کا

رواج، پدرسری نظام کے آغاز کے نظریات پدرسری نظام کا قدامت پسندانہ نظریہ، پدرسری نظام کا جدید نظریہ، ہندوستان میں پدرسری نظام کا آغاز،جنس اور صنف، صنف کی تشکیل،صنفی امتیاز پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ کس طرح خواتین کو متاثر کرتے ہیں۔

تیسرا باب۔تانیثیت کے مکاتب فکر کے نام سے موسوم ہے۔اس میں مختلف مکاتب فکر کے نظریات کی ایک جامع تصویر پیش کی گئی ہے۔

چوتھا باب۔مغربی ممالک میں تانیثی تحریکیں (فرانس،امریکہ،برطانیہ،جرمنی) پر مشتمل ہے۔

پانچواں باب۔ہندوستان میں تانیثی تحریکیں پر محیط ہے۔جس میں تمام تحریکوں کا ذکر کیا گیا ہے اور انیسویں صدی میں تانیثی تحریکیں، بیسویں صدی میں تانیثی تحریکیں، بیسویں صدی میں ایشوز پر مبنی تحریکات، دختر کشی Polygamy،ستی، بیواؤں کی شادی،چپکو تحریک، شاہ بانو بیگم کیس،شراب مخالف مہم، پر تفصیل سے بات کی گئی ہے۔

چھٹا باب۔خواتین کی تنظیموں پر محیط ہے اور NFIW ،NCWI،AIWC، WIA کی مفصل معلومات دی گئی ہیں۔اس میں بتایا گیا ہے کہ WIA ہندوستان میں پہلی تنظیم تھی جس نے خواتین کے ووٹ دینے کے حق کا مطالبہ کیا اور 1930 تک ہندوستان کی تمام ریاستوں میں خواتین کو ووٹ کا حق مل گیا۔انہوں نے اس باب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی خواتین کی تنظیم AIWC ہے۔

حصہ ج۔خواتین کی ترقی (مطالعاتِ نسواں پروگرام۔ایک حکمتِ عملی)اس کے اولین باب میں مطالعات نسواں کا تعارف اور مطالعات نسواں کے مقاصد کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا باب۔مطالعات نسواں کا آغاز وارتقاء و مطالعات نسواں اور تانیثیت کا تعلق موضوع پر مشتمل ہے۔

تیسرا باب۔ہندوستان میں مطالعات نسواں کا آغاز وارتقاء،مختلف علوم میں مطالعاتِ نسواں کی وسعت، اعلیٰ تعلیمی نظام میں مطالعات نسواں کی شمولیت کے مقاصد،مختلف علوم میں مطالعات نسواں کی وسعت ، سماجیات ، معاشیات،تعلیمات،ادب،تاریخ و آبادیات اور صحت پر مختصر تعارف پیش کرتا ہے۔اس کے بعد کتابیات پیش کی گئی ہے۔جو بہت اہمیت کی حامل ہے۔

چوتھا باب۔اختتامیہ کے طور پر نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر آمنہ تحسین اپنی اس کتاب میں لکھتی ہیں کہ یہ کتاب اردو زبان کے حوالے سے پہلی کتاب ہے جو مطالعات نسواں کا ایک جامع تعارف پیش کرتی ہے۔ میں نے اس کتاب کا وسیع مطالعہ کیا تب اس حقیقت سے روبرو ہوا کہ واقعی میں مطالعات نسواں کے متعلق اردو زبان میں یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے ذریعہ ہم مطالعات نسواں کے متعلق بہت ساری معلومات بہ آسانی حاصل کر سکتے ہیں۔مصنفہ کا کتاب لکھنے کا مقصد حقوق نسواں سے متعلق تحریکات کی تفصیلات بہم پہنچانا،خواتین

کے بدلتے موقف کا جائزہ لینا ،تانیثیت کے مفہوم سے واقف کروانا ،سماج میں خواتین کی حیثیت کا تاریخی تناظر میں جائزہ لینا ، ہندوستانی سماج میں عورت کی بدلتی حیثیت کو واضح کرنا ،خواتین کے متعلق ہندوستانی مذاہب کے نظریات کا جائزہ لینا،خواتین سے متعلق تنظیموں سے واقف کروانا تھا جو پورا ہوتا ہوا نظر آیا ہے ۔اس کتاب میں مصنفہ نے موضوعات پر مواد ترتیب دینے کے لئے بنیادی وثانوی ماخزات سے استفادہ کیا اور اردو کی چند کتابوں و رسالوں سے بھی استفادہ کر کے اس کتاب میں خواتین سے متعلق بے شمار مسائل پر بات کی ہے اور ان کے وجوہات بیان کیے گئے ہیں اس کے ساتھ ہی ان کے حل کے لئے کیے جانے والے کام پر بھی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ میڈیا سب سے بڑا ذریعہ ہے جس سے صنفی تصور جنم لیتا ہے جو سماج میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔صنف سے مراد سماج کے بنائے ہوئے مخصوص کردار ہوتے ہیں،جنس کے تحت مرد وعورت جو سماجی کردار ادا کرتے ہیں اسے صنف کہا جاتا ہے جس کی تشکیل سماج میں ہوتی ہے اور یہ سب پدرسری نظام کی ہی دین ہے حالاں کہ پدرسری نظام نہ تو فطری ہے اور نہ ہی ابدی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ یہ انسان کا بنایا ہوا ہے۔جو خواتین پر ظلم کی وجہ بنتا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت ہونے کے بعد سے لے کر آج تک مطالعات نسواں کے طلباء اور اسکالرز کے ساتھ ساتھ عام اردو قارئین کو بھی تانیثی نظریات اور تانیثی فکر کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے جس سے وہ استفادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔اس کتاب میں سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا گیا ہے ۔تاکہ قارئین کو آسانی سے سمجھ میں آجائے ۔ایک اچھے مصنف یا مصنفہ کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ ان الفاظ کا استعمال کرے جو قارئیں کو سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ اس سے مکمل استفادہ کر سکے۔جس سے کتاب لکھنے کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔وہ ساری خوبیاں اس کتاب میں نظر آتی ہیں جو ایک اچھی کتاب کے لئے تسلیم کی جاتی ہیں۔

☆☆☆

اہم نصیحتیں

☆ پڑھیں ---- انتخاب کے ساتھ

☆ غور کریں ---- گہرائی کے ساتھ

☆ خدمت کریں ---- لگن کے ساتھ

☆ بحث کریں ---- دلیل کے ساتھ

☆ بولیں ---- اختصار کے ساتھ

☆ مقابلہ کریں ---- جرأت کے ساتھ

☆ عبادت کریں ---- محبت کے ساتھ

☆ بات سنیں ---- توجہ کے ساتھ

☆ زندگی طے کریں---- اعتدال کے ساتھ

اللہ عمل کی توفیق عطا کرے (آمین)

oOo

ڈاکٹر محمد علی رفعت آئی اے ایس
حیدرآباد

تذکرۂ سخنورانِ دکن
(بوؔم کھنڈراتی)

ہندوستان کا ہر صوبہ کسی نہ کسی پیداوار کی کثرت لئے مشہور ہے ۔جیسے پنجاب میں دو چیزوں کی پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے' گیہوں اور ٹرک ڈرائیور۔اسی طرح دکن کے علاقے میں بھی دو چیزوں کی پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے' دھان اور شاعر۔آج میسور اور بنگلور سے لے کر ناندیڑ واورنگ آباد تک شاعروں ادیبوں اور خود ساختہ علاماؤں کی بھرمار ہے ۔ہر گلی میں ایک ادبی انجمن موجود ہے۔ ہر بڑے شہر میں کسی آل انڈیا قسم کے مشاعروں کا برپا ہونا لازمی ہے۔ اوسط درجے کے ہر شہر اور بڑے شہر کے ہر محلے میں کم از کم ایک درجن استاد شاعر' چار چھ درجن ابھرتے ہوئے اور دو ایک علامہ ضرور پائے جاتے ہیں ۔بعض حضرات تو پیدائشی علامہ ہیں ۔ادب کی تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر ان سخنورانِ دکن کے احوال ان کی زندگی ہی میں نہ رقم کر لئے جائیں ۔فہرست ویسے کافی طویل ہے لیکن ہم چند منتخب علاماؤں اور سخنوروں کے حالات سے اپنی بات شروع کرتے ہیں' جن میں قابل ذکر علامہ بوؔم کھنڈراتی' حضرات چغد صحرائی' جھینگر سوراخی' خیؔر خیراتی' روشؔن قندیلی' پیدؔل بھونگیری اور ترؔکل عادل آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تذکرہ کا آغاز ہم علامہ بوؔم کھنڈراتی کے حالاتِ زندگی سے کرتے ہیں کیوں کہ یہی سب سے زیادہ پرجوش اور دھماکہ خیز ہیں ۔علامہ بھی کہلائے جاتے ہیں اور استاد شاعر بھی ہیں۔

بوؔم ان کا اصلی تخلص نہیں تھا ۔یہ جب بھی اسٹیج پر نمودار ہوتے بوم بوم' بوم wanted کا غلغلہ اٹھتا۔اس بوم wanted میں انہیں اپنائیت نظر آئی تو حضرت نے اپنا تخلص بوم رکھ لیا لیکن کھنڈراتی کے اضافے کے ساتھ۔یہ بڑے صاف گو اور حقیقت پسند ہیں ۔چوں کہ رہائش ایک ایسے مکان میں جو مکان کم ہے اور کھنڈر زیادہ' لہٰذا انکسار و حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کھنڈراتی کا اضافہ کرلیا۔اگر کوئی ملاقات کے لئے آجائے تو فرماتے ہیں:

''انہیں کھنڈروں سے ہوکر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے''

حالات زندگی:

جب ہم ان کے دیوان خانے میں پہنچے تو کوئی نصف درجن شاعرات کو انہیں گھیرے ہوئے پایا۔جن میں سولہ برس سے لے کر چھیاسی برس تک کی شاعرات شامل تھیں'

ہمارا پہلا سوال ان کی تاریخ پیدائش یا عمر سے متعلق تھا۔ ہمیں شک ہوا کہ خواتین کی ایسی دھنک کے درمیان وہ اپنی عمر یا اپنی تاریخ پیدائش کا افشا کریں گے؟ ہمارا شک درست ہی نکلا۔ جب ہم نے سوال داغا تو وہ شاعراتن' شاعراتن' شاعراتن' شاعرات کی گردان کروا رہے تھے۔ جواب میں فرمایا کہ میں اب جب کہ نہ صرف پیدا ہو ہی گیا ہوں بلکہ نوجوانی کی حدیں پار کر کے جوانی کی دہلیز پار کرنے میں لگا ہوں کہ یہ پار ہوتی ہوتی نہیں تو میری تاریخ پیدائش جان کر کیا کرو گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ جنگ عظیم کے آس پاس پیدا ہوا جس کے اثرات میری زندگی میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ پھر فرمایا:

کیا جانے کب سے ہوں میں جہانِ خراب میں
جنگ عظیم کو بھی رکھوں گر حساب میں

اس کے بعد ہم نے طے کیا کہ اس سوال کا جواب خارجی ذرائع سے معلوم کیا جائے۔

کسی نے کہا کہ بوؔم کھنڈراتی ایک سرکاری محکمہ سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں' لہٰذا دفتر سے ان کی تاریخ پیدائش کا ریکارڈ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دفتر سے وہ فائل ہی غائب تھی جس میں ان کے تقرر و وظیفہ کے احکام کی کاپیاں ہونی چاہئے تھیں۔ جب ہم نے اس مسئلہ کو ان کے کٹر حریف حضرت چغؔد صحرائی سے رجوع کیا تو آنجناب نے فرمایا کہ بھئی میں ذاتی طور پر ایسی کوئی دستاویز نہیں رکھتا جو اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکے' ہاں البتہ دکن کے قدیم شاعر جناب خضؔر حیاتی (جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ پیدا ہوئے تھے) نے مجھ سے کہا تھا کہ بوؔم کھنڈراتی پہلی جنگ عظیم کے وقت ہی عالم طفلی کی حدوں کو پار کر رہا تھا اور اس نے اس دور کے ان تمام مشاعروں میں شرکت کی تھی (بہ حیثیت سامع) جن میں علامہ اقبال' جگر مرآدآبادی نے اپنا کلام سنایا تھا۔ اس کے بعد چغؔد صحرائی نے فرمایا کہ اس معاملہ میں اگر کہیں (بشمول عدالت) کوئی حلفنامہ داخل کرنا ہو تو میں حاضر ہوں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت خضر حیاتی بھی اس کے لئے آمادہ ہوں گے۔

ہم نے چغؔد سے کہا کہ جب بوؔم جوانی کی دہلیز والی بات کر رہے تھے تو ان کی شاگرداؤں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی تھی تو چغؔد نے پوچھا کونسی شاگردہ؟ وہ جو ۸۶ سالہ ہے یا وہ جو سولہ سالہ ہے۔ پھر فرمایا سولہ برس والی نے تو اس کا مطلب ہی نہ سمجھا ہوگا۔

ہم نے محسوس کیا کہ بوؔم کھنڈراتی کے دشمن سے ربط پیدا کرنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ ہم یہ بھول گئے کہ چغد عدالتوں میں حلفیہ بیان دینے اور حلف نامے داخل کرنے کا خاص تجربہ رکھتے ہیں۔ ہمارے دوست ہشیار الحسن ہاشمی نے دوراندیشانہ مشورہ دیا کہ بوؔم کی عمر اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے حاصل کی جائے۔ پوسٹ مارٹم اس لئے بوم بوؔم کھنڈراتی کے نہ صرف دشمن بلکہ خاص دوستوں کو بھی اس کا یقین ہے کہ یہ طبعی موت نہیں مرے گا۔ وجہ صاف ہے کہ بوم بوؔم کی حقیقت پسندانہ خاکہ نگاری اور حریفوں کی ''چڈی'' اترائی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ہر دن اس کے قتل کا خدشہ لگا رہتا ہے۔

حالات زندگی میں تعلیم کا بھی ایک کالم ہوتا ہے۔ بوؔم نے بتایا کہ وہ بی۔اے پاس ہے۔ جواباً چغد صحرائی نے فرمایا کہ بوؔم نے کئی پٹخیاں کھانے کے بعد میٹرک کامیاب کیا تھا۔ میٹرک کے چھ پرچوں میں پہلی مرتبہ وہ پانچ پرچوں میں فیل ہوا۔ چھ مرتبہ کوشش کے بعد ہر امتحان میں ایک پرچہ پاس کرتے ہوئے وہ میٹرک کامیاب ہوسکتا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ بوؔم کے سرپرست ایک اعلیٰ عہدہ دار نے یہ شرط لگا رکھی تھی کہ اگر وہ میٹرک پاس کرے گا تو اسے سرکاری ملازمت دلوائی جائے گی ورنہ چاہے وہ انہیں ہزار مشاعروں میں مہمان خصوصی بنالے سرکاری ملازمت کی اس کی خواہش پوری نہیں کی جا سکے گی۔ ویسے اس کی شاگرداؤں کا اشرار ہے کہ بوؔم کھنڈراتی کی شخصیت پر پی ایچ۔ڈی کی جانی چاہئے، چہ جائیکہ ان کی ڈگریوں کی تفتیش ہورہی ہے۔ بات کچھ وزن رکھتی ہے۔

یوں بوؔم کی شخص کے متعلق دوسرا سوال بھی تنازعہ کا شکار ہوچکا تھا۔

ادبی خدمات:

ابھی ہماری تحقیق جاری تھی کہ دکن کے ایک بڑے شہر میں ایک کل ہند قسم کے مشاعرہ میں شرکت کا موقع ملا۔ ساری محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بوؔم کھنڈراتی ترنم سے کلام سنا رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کھنڈر میں کوئی بوم گھم گھپ کی گھن گرج گرم کیے ہوئے ہو۔ ہم بعد مشاعرہ اسٹیج پر گئے تو بوؔم نے ہمیں گلے لگا لیا اور پوچھا کہ ہاں بھئی آپ کا وہ مقالہ ''تذکرۂ سخنوار دکن'' کہاں تک پہنچا۔ ہم نے کہا چل رہا ہے۔ اس دوران ہم نے غور سے دیکھا کہ بوؔم اپنی گھنی زلفوں میں زلف عنبر بیر آئیل لگائے ہوئے تھے۔ یہ وہی تیل ہے جو اُن کی اکثر شاگرداییں لگاتی ہیں۔ شیروانی دیکھ کر اندازہ ہوجاتا تھا کہ ان کے ولیمے میں ہی سلائی گئی ہوگی اور گرمجوشانہ معانقہ کے بعد لگتا تھا کہ خود ہمارا لباس مشکبار ہوگیا ہو۔ ہمارا یہ گمان گمان ہی رہ گیا کہ موصوف جمعہ جمعہ ضرور نہاتے ہوں گے۔

ادبی خدمات کے ضمن میں یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ دکن کی وہ خواتین جو شوقیہ شاعرہ بننا چاہتی تھیں ان کی اکثریت کے کلام پر علامہ بوؔم کھنڈراتی اصلاح فرمارہے ہیں۔ طبعزاد اور اوریجنل قسم کی شاعرات ان کے کھنڈر کا رخ نہیں کرتیں۔ ایسی شاعرات سے بوؔم کو خدا واسطے کا بیر ہے۔ حضرت خواتین کے مشاعروں میں اپنی شاگرداؤں کو اوریجنل شاعرات سے آگے بڑھانے میں لگے رہتے ہیں اور بعض چہیتی شاگرداؤں کے ہاتھ میں اپنی بیاض اور کبھی مطبوعہ کلام بھی تھمانے سے نہیں چوکتے۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلتا ہے۔ شاگردانِ بوؔم مشاعرہ لوٹ کر نکلتی ہیں جب کہ اوریجنل شاعرائیں اپنی اوریجنل حالت میں گھروں کو لوٹتی ہیں۔

خاتون شاعروں کے کلام کی اصلاح بہت زمانے سے جاری ہے اور یہی وصف استاد شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت کا باعث ہے۔ یہ کام بوؔم کھنڈراتی اس وقت سے کرتے آرہے ہیں جب کہ خود ان کے کلام کی اصلاح ان کے استاد علامہ تاراؔج پولیس ایکشنی جاری رکھے ہوئے تھے۔

بوؔم کھنڈراتی دوران ملازمت بھی اپنے دفتر کی

حدود میں مشاعرے برپا کرواتے رہتے اوراپنے اعلیٰ عہدہ داروں کومہمان خصوصی بنایا کرتے تھے۔ان مشاعروں میں اپنی چہیتی شاعرات کوبھی پیش کرتے رہتے اورمشاعرے خوب چلتے۔اعلیٰ عہدہ داروں سے قربت کی بنا آپ نے کئی بارکوشش کی کہ انہیں ملک الشعراء کا خطاب دیا جائے۔ایک مرتبہ وہ خطاب کسی بڑے شاعر کوملا اس کے بعد جب بوؔم نے باقاعدہ درخواست دی تو وہ دفتر ہی برخواست ہوگیا۔اس کے بعد آں جناب نے ان مشاعروں کی گنتی مع دن' تاریخ اورمقام کے ایک بڑے سے رجسٹر میں درج کرلی ہے جن میں آپ نے شرکت کی تھی اورکوشش میں ہیں کہ ان کا نام سب سے زیادہ مشاعرے پڑھنے والے کی حیثیت سے Guinness Book of World Record میں آجائے۔ہم دعا گو ہیں کہ ان کی درخواست کی یکسوئی تک اس ادارے کا دفتر قائم رہے۔

ویسے بوؔم کی ادبی خدمات آج بھی جاری ہیں۔ اپنے حریفوں اوردیگرکم ظرفان دکن سے انتقام لینے کے لئے حضرت نے ایک اخبار جاری کیا ہوا ہے''گلفامِ دکن''۔اپنے آپ کو پہلے اڈیٹر لکھتے تھے بعد میں چیف اڈیٹر اورآج کل اڈیٹرِان چیف لکھ رہے ہیں۔چندصحرائی نے فرمایا انداز ارتقائی ہے یعنی''پہلے گل اورپھرگلبدن' پھرگل بہ داماں ہوگئے''۔

لیکن ان کے اخبار کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ روزنامہ ہے،سہ روزہ ہے، ہفت روزہ ہے یا ماہنامہ ہے۔یہ اسی وقت شائع ہوتا ہے جب بقول بوؔم دکن کے کسی کم ظرف یا بدمعاش کی کارگزاریوں کا پردہ پاش کرنا ہوتا ہے۔ بوؔم اسے رسم چڈی اترائی کا نام دیتے ہیں۔بوم کہتے ہیں کہ یہ بڑا نیک کام ہے اورمفاد عامہ ان کے پیش نظر ہے۔یہ کام اسی وقت انجام دیا جاتا ہے جب وہ کم ظرف حضرت بوؔم کی بےعزتی کرتا ہے یا کسی اورطرح سے ان سے ٹکر لیتا ہے۔ اگروہ شاعر یا ادیب ہوتو سمجھ لوگیا کام سے۔بےعزتی میں کسی بڑے مشاعرے میں مدعو نہ کرنا بھی شامل ہے۔اب جواس کی نقاب اترائی یا چڈی اترائی شروع ہوتی ہے تو اتنی باریکی اورنفاست سے کہ کیا اورنگ آباد کا''ھمرو''اورکیا ڈھاکے کا 'ململ'؟۔محسوس یہ ہوتا ہے کہ صنعتِ ریشم سازی کی بلندیوں پر پہنچ گئے ہوں۔پرت درپرت اس کی زندگی کے ہر پہلو کو بےنقاب کیا جاتا ہے۔پہلے اس کا شجرہ نسب آشکار ہوتا ہے پھر اس کے خاندان کے بزرگ کن کن معزز پیشوں سے وابستہ رہے(جیسے صیقل گر،بہشتی،موچی،باورچی،حلال خوروغیرہ)۔ اس کا دستاویزی ثبوت اپنے موقر اخبار''گلفامِ دکن''میں چھاپا جاتا ہے۔پھراس کی شادی کا پس منظر بیان کیا جاتا ہے (کہ شادی سے پہلے وہ اپنی بیوی کے ساتھ کتنی مرتبہ گھر سے بھاگا تھا) اوریہ کتنی خواتین کے ساتھ بھاگنے کے بعد موجودہ بیوی کے ساتھ اس کی شادی لڑکی کے ماموں کی ہاکی اسٹک اورلڑکی کے چچا کی تلواروں کی چھاؤں میں ہوئی تھی وغیرہ۔ کبھی کبھارایسے مناظر کی تصاویر دستاویزی ثبوت کے طور پر چھاپی جاتی ہیں۔

غرض زندگی کا کوئی پہلوایسانہیں جواُن کی نظر سے پوشیدہ رہا ہواورجواپنے اخبار میں نہیں چھاپا ہو۔ان کی اس کاریگرانہ صناعی صحافت کو دیکھ کر سیاسی لیڈر بھی ان سے

بالواسطہ فائدہ اٹھانے میں لگ گئے ہیں ۔ ہوا یوں کہ دکن کی ایک مشہور سیاسی جماعت کے نمائندے شیخ بندے علی جب قانون ساز اسمبلی کے لئے ٹکٹ لے کر آئے تو حزبِ مخالف کے شیخ گھڑو نے اپنے انتخابی جلسے میں بندے علی کا وہ شجرہ نسب پیش کیا کہ خود بندے علی بھی بہت سی باتوں سے ناواقف ہی تھا ۔ بندے علی بہت غور وخوض کے بعد اور اپنے مشیروں سے سر جوڑ کر بیٹھنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچا کہ حضرت بوؔم کو انجانے میں استعمال کیا جائے ۔ چنانچہ وہ کھنڈر بوؔم مع اپنے حواریوں کے پہونچا اور بوؔم کی وہ وہ تعریفیں کیں کہ انہیں علامۃ الدّھر بھی کہہ ڈالا ۔ جاتے جاتے ایک موٹی رقم گلفامِ دکن میں انتخابی اشتہار کے لئے تھما دی ۔ بوؔم نے نہ صرف یہ کہ اشتہار چھاپا بلکہ بندے علی کی تائید میں اداریہ بھی لکھ مارا ۔ ادھر شیخ گھڑو نے ایک انتخابی جلسہ میں بوؔم کا شجرہ نسب پیش کرنے کی کوشش کی ۔ کہ ان کے دادا کے چچا حلال خور تھے اور خوشبو والا کام کیا کرتے تھے ۔ بوؔم کھنڈراتی بہت بلبلائے اور اس کے بعد انہوں نے شیخ گھڑو کی سات پشتوں کا تعارف اپنے اخبار میں اس طرح پیش کیا کہ کیا کوئی سی آئی ڈی کا محکمہ کر سکے گا ۔ اس کے بعد بندے علی کے ہر انتخابی جلسے میں بوؔم کے گلفام سے اقتباسات پڑھے جانے لگے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ گھڑو بہ مشکل اپنی ضمانت بچا پایا ۔ اب یہ سننے میں آرہا ہے کہ شادی بیاہ کے معاملات میں بھی لوگ بوؔم کی فنکارانہ ریسرچ سے استفادہ کرنے کی حکمت عملی میں لگے ہوئے ہیں تاکہ فریقین کو ایک دوسرے کے بارے میں معلومات فراہم ہوسکیں اور نکاح سے پہلے پورا اطمینان حاصل ہو ۔ بوؔم کے شاگرد تڑکلؔ بھونگیری یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ بوؔم کی صحافتی خدمات ادب اور سیاست سے گزر کر دیگر شعبہ ہائے حیات تک پھیل رہی ہیں اور انہیں نہ صرف یہ کہ کارنامہ حیات ایوارڈ دیا جانا چاہئے بلکہ آگے چل کر کیا عجب کہ انہیں ''بھارت رتن'' سے بھی نوازا جائے ۔ جواباً چغدؔ صحرائی نے کہا ''ہاں اگر وہ اگلے چند برس تک زندہ رہ پائیں تو شاید'' ۔

صحافتی خدمات تو بہت وسیع ہیں ہی ہم نے ان کی شاعرانہ خدمات کا احاطہ کرنے کا ارادہ کر کے ''کھنڈر'' کا رخ کیا ۔

بوؔم ہمیں دیکھ کر خوش ہوئے ۔ ہم نے نمونہ کلام کی فرمائش کی تو ازراہ عنایت کلام کے ٹکڑے یہ کہہ کر پیش کئے کہ یہ میرے جگر پارے ہیں :

لنگی میں مونہہ چھپا کر روتا رہا میں شب بھر
تو آ بھی جاتی ظالم اے جانِ بوؔم کھنڈر

ہم نے عرض کیا کہ حضور کچھ گل وبلبل والے نمونے ہو جائیں ۔ بہت خوش ہوئے فرمایا لو سنو :

دور سے آئے تھے دلبر سونگھنے زلفوں کی بو
پھر تمہارے باب کٹ نے دل میرا چھوٹا کیا

ہم : سبحان اللہ استاد کیا بات ہے ۔ کلام میں علامگی جھلک رہی ہے ۔

بوم : میاں یہ تو صرف نمونہ ہے کلام ہے ۔ مبتدی حضرات کو اور ساتھ ہی خود ساختہ علاماؤں کو میرا غیر جانبدارنہ مشورہ ہے کہ وہ میرا مجموعہ ''پیار کا شعلہ'' ضرور پڑھیں :

جس میں ہے کچھ عقل و شعور
پیار کا شعلہ پڑھے ضرور

جی چاہے تو پڑھ ڈالے
کوئی نہیں کرتا مجبور

ooo

اس کے مطالعہ سے وہ شاعری کے رموز اوقاف سیکھ پائیں گے اور شاعرات کی خدمت میں عرض ہے کہ جب تم ہمارا مطبوعہ کلام پڑھو گے تو پھولوں کی خوشبو، زلفو ں کی مشک بو اور مست آنکھوں کے جام وسبو میں ڈوب جاؤ گے۔

ہم: بے شک استاد لگتا تو ایسا ہے کہ آپ کے حریفوں خاص طور پر چغدؔ صحرائی کے پاس یہ بات کہاں ؟ ویسے آپ نئی نسل کے تک بندی کرنے والوں کے لئے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

بوم: بے شک شاعری کا شوق رکھنے والے مبتدی چاہے میرے پاس نہ آئیں لیکن چغدؔ جیسے رزیل شعراء کے قریب بھی نہ پھٹکیں ، ہاں شاعرات کے لئے میرے کھنڈر کے دروازے ہمیشہ کے لئے کھلے رہیں گے۔

محل تاریک ہیں لیکن میرا کھنڈر تو روشن ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

ooo

صاف ظاہر تھا کہ دوسرا مصرعہ نشورؔ واحدی کا تھا۔ ہم نے انہیں متوجہ کیا تو فرمایا وہ غزل انہیں میں نے ہی لکھ کر دی تھی ۔اس کے بعد ہم نے ان سے رخصت چاہی اور یہ وعدہ کیا کہ علامتی شاعری اور جدید شاعری کے نمونے حاصل کرنے کے لئے ہم پھر کبھی حاضر ہوں گے۔

چند دن بعد ہم نے دوبارہ کھنڈر کا رخ کیا تو ہم نے دیکھا کہ بومؔ سجدہ میں پڑے ہیں ۔لیکن ہمارے آنے کے بعد بھی انہوں نے سجدہ سے سر نہ اٹھایا تو ہمیں تشویش ہوئی تو ہم نے کھنکھار کر اپنی آمد کا اعلان کیا ۔ چند لمحوں کے بعد بومؔ نے سجدہ سے سر اٹھایا تو ہم نے پوچھا استاد بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ عبادت ہو رہی تھی ۔ تو فرمایا میاں عبادت کہاں ؟ میں اکثر پیٹ کی گڑبڑ دور کرنے کے لئے سجدہ میں چلا جاتا ہوں ۔اس سے دو فائدے ہیں ۔ایک تو بندے میں عاجزی پیدا ہوتی ہے دوسرے میرے پیٹ کی ساری گیس خارج ہو جاتی ہے۔

پھر فرمایا کہ گیسس مجھے اکثر ستاتی رہتی ہیں ۔ استاد کے ان عالمانہ وحکیمانہ خیالات کو سننے کے بعد ہم موضوع کی طرف لوٹ آئے ۔ہم نے کہا استاد سنا ہے کہ جدید شاعری پر بھی استادانہ کلام کہہ چکے ہیں ۔ کچھ نمونے ہو جائیں ۔ فرمایا لیجئے سنئے پہلے علامتی نمونے:

دیکھو تو عجب ماجرا ہے
توے پہ کولسہ دھرا ہے

ooo

یہ ایک ہی شعر ہماری گیس نکالنے کے لئے کافی تھا۔ ہماری سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ ہم نے استاد سے یہ کہتے ہوئے رخصت چاہی کہ علامتی اور جدید نمونوں کا مطلب جاننے کے لئے آپ کے کھنڈر پر دوبارہ حاضر ہوں گا۔ خدا حافظ ۔ بوم کو ایک چھینک آئی' ناک صاف کی اور کہا:

خدا حافظ۔

☆☆☆

ڈاکٹر محبوب فرید
ملے پلی، حیدرآباد

دِل نادان تجھے ہوا کیا ہے؟

سویڈن سے خبر آئی ہے کہ وہاں کے فاضل سائنسدانوں نے مصنوعی دل بنانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے ۔فی الحال اس کا کامیاب تجربہ چوہوں پر کیا گیا ہے کیونکہ چوہے انسانوں سے کئی اعتبار سے ملتے جلتے ہیں ۔یا یوں کہیے کہ بعض انسان چوہوں کے مشابہہ ہوتے ہیں ۔ چوہوں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے مالک کا سارا مال ہضم کرجاتے ہیں اور مالک بے چارے کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی ۔اس میں شک نہیں کہ چوہا ڈرپوک مگر چالاک ہوتا ہے کبھی کبھی اس کی یہی ڈیڑھ ہوشیاری اسے جال میں پھنسا دیتی ہے ۔لیکن یہ بلی سے بہت ڈرتا ہے ۔بلی کی غیر موجودگی میں اس کے خلاف بہت کچھ کہتا ہے ۔ غیبتیں ہی نہیں بلکہ بہتان تراشیاں کرتا ہے ۔لوگوں کو بلی کے خلاف بھڑکاتا ہے ۔ جلسے، جلوس اور ریلیاں بھی نکالتا ہے ۔مگر اس کے سامنے جاکر کچھ کہنے سے ڈرتا ہے ۔مگر انسانوں کی طرح چوہا بھی اپنی اہلیہ سے بہت محبت رکھتا ہے کیونکہ وہ چوہے کے بچوں کو دودھ پلاتی ہے ۔اس لئے وہ محنت ومزدوری کرے نہ کرے اپنے بیوی بچوں کا نان ونفقہ شرافت کے ساتھ ادا کرتا ہے ۔

سویڈن کے سائنسدانوں کا ماننا ہے کہ چوہوں کا دل بھی انسانوں جیسا ہوتا ہے ۔جب کسی پر آجاتا ہے تو اپنی جان تک دینے تیار ہوجاتا ہے اور جب ناراض ہوجائے تو ان کی جان لینے تک آمادہ ہوجاتا ہے ۔انسان کا مٹھی بھر دل دن میں تقریباً ایک لاکھ مرتبہ دھڑکتا ہے اور دو ہزار گیلن خون پمپ کر کے جسم کے کونے کونے تک پہنچاتا ہے ۔بعض محققین کا خیال ہے کہ عورت کے دل کا وزن آٹھ اونس اور مرد کے دل کا وزن دس اونس ہوتا ہے، یعنی مرد کا دل بڑا ہوتا ہے ۔ دل میں وسعت بھی زیادہ ہوتی ہے ۔ دو دو، تین تین، چار چار بھی اس کے دل میں آسانی سے رہ سکتے ہیں ۔ہمیں یقین ہے کہ سوئڈن کے سائنسدنوں نے اس فرق کا ضرور خیال رکھا ہوگا ۔البتہ انہوں نے اس بات انکشاف کیا کہ وہ جو مصنوعی دل بنا رہے ہیں وہ قدرتی دل کی طرح چار خانوں پر مشتمل ہوگا ۔ چار خانوں کی مصلحت اللہ جانے یا کوئی دل والا ۔

سائنسداں بھی عجیب ہوتے ہیں کبھی چین سے نہیں بیٹھتے اور بیٹھنا بھی نہیں چاہیے۔ اگر وہ آرام سے بیٹھ جاتے تو آج ہمیں بجلی ملتی نہ اسمارٹ فون' ہوائی جہاز ملتا اور نہ چاند میں جانے کے لئے راکٹ' مگر انھیں انسانی اعضا کے بارے میں سوچ سمجھ کر دخل اندازی کرنی چاہیے۔ ان کی بعض حرکتوں کی وجہ سے لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ کم از کم خون' دل' جگر' گردے اور آنکھوں وغیرہ کی تبدیلی Replacement کے بارے میں محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ان کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے بہت سارے لوگ جو پہلے تھے اب ویسے نہ رہے۔

ہمارے ایک دوست شام میں تھکے ہارے آفس سے گھر آرہے تھے۔ بڑے نیک' سیدھے سادھے' بھولے بھالے' شرمیلے' سخی داتا۔ کبھی کبھار آفس کی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے شوق بھی کرلیا کرتے تھے۔ شائد اس دن بھی اسی طرح حالت غیر میں تھے کہ گلی کے کسی کتے نے انھیں پہچاننے سے انکار کردیا اور ان کے جسم پر اپنی ناراضگی کے نشان بھی چھوڑ دیئے۔ شرم کے مارے انھوں نے گھر میں اس عظیم حادثہ کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جب حالات قابو سے باہر ہونے لگے تو شہر کے قدیم سرکاری ہاسپٹل سے رجوع کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے ان کی گمبھیر حالت کو دیکھ کر ہاسپٹل میں شریک کرلیا۔ دو چار دن میں محلے میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ موصوف پانی سے ڈرنے لگے ہیں اور غیر انسانی آوازوں میں لوگوں کو ڈرانے لگے ہیں۔ رفعحاجت کے طور طریقوں میں غیر معمولی تبدیلی دیکھی گئی۔ تب لوگوں کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ ان کے بدن میں کسی پاگل کتے کی روح سرائیت کرگئی ہے۔ آخر کار ان کے گھر والوں کو ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ ان کا پورا خون بدلنا پڑے گا مرتا کیا نہیں کرتا۔ بڑی مشکل سے ان کا خون ملا۔ تب ڈاکٹروں اور نرسوں نے راحت کی سانس لی۔ جب وہ پوری طرح صحت یاب ہوکر گھر آگئے تو نئی زندگی کی خوشی میں گھر والوں نے ایک تقریبِ صحت یابی کا اہتمام کیا۔ لیکن محفل میں ان کی حرکتوں کو دیکھ کر رشتہ دار اور دوست احباب ششدر رہ گئے۔ لباس کے انتخاب میں بھی کافی تبدیلی آگئی تھی پھر فصیح اردو کی جگہ وہ گاڑی ہندی بولنے لگے۔ دین سے جتنے قریب تھے اس سے کہیں زیادہ دنیا کے قریب ہوگئے۔ پہلے سخی داتا ہوا کرتے تھے لیکن اب چڑی جائے پر دمڑی نہ جائے کی منہ بولتی تصویر بن گئے تھے۔ ہمارے ایک دوست جو اتفاق سے محقق بھی ہیں انہیں ہر کسی کے گھریلو معاملات میں تحقیق کرنے میں مزہ آتا ہے چنانچہ انہوں نے خبر لائی کہ ہمارے دوست کو جو خون چڑھایا گیا تھا وہ دراصل ایک خاص کمیونٹی کے تاجر کا تھا اور اب ان کا خون رنگ دکھا رہا تھا۔ بعض لوگوں کا تو کہنا ہے کہ یہ بالکل سچا واقع ہے۔ دروغ بر گردن راوی۔

حال ہی میں ایک کار حادثہ میں ایک ضعیف خاتون کا دل زخمی ہوگیا۔ اتفاق سے وہ خاتون متمول بھی تھی' شائد اس لئے ڈاکٹروں نے یہ اعلان کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں کی کہ اس خاتون کی جان صرف ہارٹ ٹرانس پلانٹیشن کے ذریعہ ہی بچائی جاسکتی ہے۔ آدمی کے پاس مال ہو تو دل

ہی کیا جان بھی خریدی جاسکتی ہے ۔تھوڑی سی تگ و دو کے بعد دل مل گیا۔ وقت اتنا کم تھا یا ڈاکٹروں نے یہ معلوم کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ یہ دل کس کا ہے؟ ان کے پیش نظر تو صرف مال اور مال دار خاتون کی جان بچانا مقصود تھا۔ جب وہ صحت مند ہوکر گھر آئی تو غریبوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔مگر خاتون کے لب ولہجہ اور حرکات سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ اب پہلی جیسی نہیں رہیں بلکہ اندر سے کوئی پاپ سنگر بول رہا ہے ۔یہ تو دل سے دل بدلنے کا نتیجہ تھا۔اب تو گوشت پوست کے دل کی جگہ پلاسٹک اور فائبر کے دل کی بات ہورہی ہے۔اللہ جانے یہ دل کیا گل کھلائے گا۔

ہم سوئڈن کے فاضل سائنسدانوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کی لیبارٹری میں بنائے ہوئے دل میں خلوص محبت' ایثار قربانی کے جذبات واحساسات ہوں گے؟ ماں باپ بھائی بہن اور بیٹا بیٹی سے محبت ہوگی ۔کیا یہ دل شرافت اور ادب و احترام کی صفت سے آراستہ ہوگا ۔ فیاضی اور عفوودرگزر کی خو بو ہوگی یا نہیں؟

شاعری کسی بھی زبان کی ہو اس کا انحصار دل اور اس کی کیفیت پر ہوتا ہے ۔ ہندی اور اردو شاعری کے گلشن کا کاروبار دل ہی سے چلتا ہے ۔اس مصنوعی دل سے اس کا کاروبار مندی کا شکار ہو جائے گا۔

مرزا غالب نے کہا تھا۔

دلِ نادان تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

کیا اس درد کی دوا مصنوعی قلب کے پاس ہوگی ؟ بہت ممکن ہے اسکی ہر دھڑکن پر ٹیکس عائد کیا جائے گا اور وہ اسی ٹیکس کے خوف سے ایک دن وہ دھڑکنا چھوڑ دے گا ۔آنکھوں کے عدسے کی قیمت کی طرح اس دل کی بھی مختلف قیمتیں ہوں گی ۔امپورٹڈ دل کی قیمت ظاہر ہے دیسی دل سے زیادہ ہوگی ۔ یہ دل لگائے بغیر ہی ہماری نئی نسل پیزہ' برگر اور پیپسی کی دلداہ ہے ۔جینس جرکن اور اسپورٹس شوز وغیرہ اس کے محبوب ہوگئے ہوں تو پھر مصنوعی دل کے بعد کیا ہوگا۔اللہ ہی جانے ۔

☆☆☆

دوستوں کے درمیان ہشاش بشاش رہو

دوستوں پر اعتماد کیجئے' ان کے درمیان ہشاش بشاش رہیے۔ دوسروں کو افسردہ مت کیجئے ۔دوستوں کی صحبت میں بے تکلف اور خوش مزاج رہیے۔تیوری چڑھانے اور لئے دیئے رہنے سے پرہیز کیجئے ۔دوستوں کے ساتھ ایک بے تکلف ساتھی' خوش مزاج ہم نشین اور خوش طبع رفیق بننے کی کوشش کیجئے۔آپ کی صحبت سے احبات اُکتائیں نہیں بلکہ مسرت' فرحت اور خوشی محسوس کریں۔حضرت عبداللہ بن حارثؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔(ترمذی)۔حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی صحبت میں 100 مجلسوں سے بھی زیادہ مجلسوں میں بیٹھا ہوں' ان مجلسوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اشعار بھی پڑھتے تھے اور زمانۂ جاہلیت کے قصے کہانیاں بھی سناتے تھے' حضور ﷺ خاموشی سے سنتے رہتے تھے۔(ترمذی)

oOo

حنیف سیّد
۱۲ / ۳۴
سوئی کٹرا۔آگرہ ۲۸۲۰۰۳۔(یو،پی) انڈیا۔

ضِدّی

میری تحریر پڑھ کر، جب اُس نے سگریٹ کی ڈبی مَسَل کر پھینکی، تب لگا جیسے مرنے کے بعد پھر زندہ ہوگیا مَیں۔ یعنی کہ میری عمر مل گئی، اُس کو۔مطلب یہ کہ دعا قبول ہوگئی میری۔ جب بھی کوئی عظیم شخص مرتا ہے، تب یہی دعا مانگتا ہوں کہ وہ زندہ ہوجائے ،اور مَیں مر جاؤں۔ مَیں مرگیا ، تو کیا....؟ ایک معمولی انسان ہی تو تھا مَیں۔دے ہی کیا رہا تھا دنیا کو....؟ کچھ بھی تو نہیں۔ ہاں اگر وہ مرجاتا تو ....؟ تو دنیا ایک ایسے ا فسانہ نگار سے محروم ہوجاتی ،جو اپنے افسانوں سے ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کر رہا ہے۔

ہوا یوں کہ ایک روز کھانستے کھانستے جب اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا، تو مَیں نے جھلّا کر کہا:''یہ سزا ہے ، تمھارے گناہوں کی۔''

''گناہوں کی سزا، اور میرے....؟'' کھانسی کے سبب بہ دِقّت اُس نے دریافت کیا۔

''ہاں....! تمھارے گناہوں کی۔''

''وہ کیسے ....؟''

''ترک فرائض گناہ نہیں، کیا....؟''

''ہاں، ہیں۔لیکن مَیں کون سا فرض ترک کر رہا ہوں جنا، ب....؟'' اُس نے کھانسی پر قابو پا لیا۔

''معمولی سا بجلی کا سوئچ دبا کر، ٹی۔وی، ائر کنڈیشنر وغیرہ سے اپنی زندگی کو جنت نما بنا لیتے ہو، انٹرنٹ اور موبائل سے جب چاہو، جہاں چاہو، ہر شخص سے آمنے سامنے بات کر لیتے ہو۔ان سب میں استعمال ہونے والے ٹرانسسٹرز، ٹرانسفارمرز، آئی سیز وغیرہ کی ایجاد لاکھوں سال کی انسانی جدوجہد کے نتائج ہیں۔جن سے اَب آپ فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔مثلاً بجلی میں استعمال ہونے والے سوئچ کے پوائنٹز، تانبے یا پیتل کے اِس لیے بنائے جاتے ہیں کہ اُن میں زنگ نہیں لگتی۔ یہ پتا لگانے کے لیے کہ کس میٹل میں زنگ نہیں لگتی....؟ یا کون سے میٹل میں بجلی کی روانی بہتر ہے....؟ اِنسان کو ہزاروں سال لگے۔اگر آج کا انسان اپنے بزرگوں سے اَخذ ساری تکنیکز کو اپنے سینے میں دبا کر خودکشی کر لے، تو آنے والا انسان پھر اُسی جنگل میں پہنچ جائے گا، جہاں وہ برہنہ تھا۔لہٰذا یہ ساری تکنیکز قرض ہیں، انسان پر۔ اور اُن کا ادا کرنا، یعنی کہ آگے آنے والی نسلوں تک پہنچانا، ہمارا فرض ہے۔''

''اس کے ساتھ یہ بھی کہ انسان جس دیش میں

پیدا ہوتا ہے۔اُس کی زمین کا دانہ پانی استعمال کرتا ہے،لہٰذا اُس کا جسم اُس دیش کی امانت ہوتا ہے۔جولوگ اپنا علم سینے میں دبائے یعنی کہ اپنے دیش کا قرض ادا کیے بِنا ،شراب، بیڑی،سگریٹ اور ڈرگز وغیرہ سے اپنے جسم یعنی کہ دیش کی امانت فنا کر ڈالتے ہیں۔دیش دروہی ہیں۔اُس کے ساتھ دیش دروہی وہ بھی ہیں جو منشیات بناتے ،اور بنانے کی اجازت دینے میں کمیشن لیتے ہیں،جم کر۔'' چوں کہ غصّے اور کھانسی کے غلبے کے باعث جواب دینے میں اُسے دِقّت ہوئی،لہٰذا وہ چپکے سے زنان خانے میں سرک گیا،اور مَیں ذہن پر بوجھ لیے اپنے گھر آ گیا۔

ایک روز یوں بھی ہوا کہ ادبی گفتگو کے دوران، اُس نے کھانستے ہوئے سگریٹ سلگائی تو میرا ذہن ادبی گفتگو سے اُچھال مار کر اُس کے پھیپڑوں کے جے کف میں جا اُلجھا،اور وہ یکے بعد دیگرے سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا رہا۔جب چوتھی سگریٹ کے طویل کش سے کھنکار کے ساتھ کف کا لوتھڑا اُس کے مُنہ سے نکل کر دور جا گرا،تب میرا ذہن اُس کے کف سے نکل کر اپنی جگہ آ گیا:''یہ سگریٹ موت ہے،تمھاری۔''

''نہیں....! یہ زندگی ہے ہماری۔''اُس نے برجستہ جواب دیا۔اِس سے پہلے کہ میرا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا، وہ پھر بولا:''مَیں محسوس کر رہا ہوں کہ تمھارا ذہن ادبی گفتگو میں کم اور میری سگریٹ نوشی میں زیادہ اُلجھا ہوا ہے۔اِس لیے مَیں تمھارے کسی سوال سے پہلے آگاہ کیے دیتا ہوں کہ مجھے کوئی بیماری نہیں،بل کہ بدلے ہوئے موسم کا اَثر ہے، خدا بخشے میری والدہ کو، وہ بھی اِس بادِ زمہریر سے بری طرح متاثر ہو جاتی تھیں،یعنی کہ جب کبھی کشمیر وغیرہ میں برف گرتی تھی،تو چند ہی گھنٹوں بعد نزلہ اُنھیں اپنی گرفت میں لے لیتا تھا،اور وہ فرماتی تھیں:''ضرور کہیں برف گری ہے۔''

''کیا وہ بھی آپ کی طرح کف نکالنے کے لیے سگریٹ استعمال کرتی تھیں....؟''

''نہیں....! میری بات الگ ہے۔''

''وہ کیا....؟''

''مَیں تفصیل سے بتاوں گا،لیکن تم بار بار بیچ میں سوال مت کرو....! گفتگو کرنے کا طریقہ یہ نہیں،طریقہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی اپنی بات کہہ رہا ہو،تو غور سے سنو....! جب تک کہ بات پوری نہ ہو جائے،ممکن ہے کہ تم جو سوال کرنا چاہتے ہو،اُس کا جواب تم کو اُس کی بات میں مل جائے،اور اگر نہ ملے،تو اپنا سوال کر لو۔بیچ میں سوال کرنے سے بات کہنے والا ڈسٹرب ہو کر اکثر موضوع سے بھٹک جاتا ہے۔''بات چوں کہ سچ تھی لہٰذا مَیں خاموش رہا۔

''ہاں....! تو مَیں کیا کہہ رہا تھا....؟''اس نے ماتھے پر بل ڈال کر ذہن پر زور دیا۔

''آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کی بات الگ ہے۔''

''جی ہاں....! میری بات الگ یہ تھی کہ ماں سے وراثت میں نزلہ کچھ زیادہ ہی ملا تھا مجھے۔اسی نزلے کی بِنا پر بیس سال کی عمر میں ڈاکٹرز نے میرے ایکس رے میں بڑے بڑے داغ دیکھ کر مجھے ٹی۔بی بتا دی تھی۔جس کے سبب میرا ایک سال مسلسل علاج چلا۔صحت یاب ہونے کے دو سال

بعد میرے پھیپڑوں میں ٹی۔بی کے جرثومے پھر پائے گئے۔ پھر علاج ہوا۔ یہ سلسلہ کئی سال چلا۔ واضح رہے کہ تب تک مَیں سگریٹ نوشی کے سخت خلاف تھا۔مَیں شکر گزار ہوں اُس مضمون نگار کا، جس نے کسی ڈائجسٹ میں سگریٹ نوشی کی سخت مخالفت کے باوجود، یہ بھی لکھا تھا: ''نکوٹین کی موجودگی میں ٹی۔بی۔کے جرثومے نہیں پنپتے۔'' یہ پڑھ کر مَیں نے سوچا: ''جس سگریٹ نوشی کو مَیں آج تک مضر اور جان لیوا سمجھتا رہا، اور جس کی ہر باشعور شخص مخالفت بھی کرتا ہے، وہ آخر زندگی کے لیے کس طرح معاون ہوسکتی ہے...؟'' لیکن اپنی زندگی سے مایوس ہونے کے ناتے مَیں نے یہ رِسک لے کر سگریٹ نوشی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ مَیں چین اسموکر کہلانے لگا۔ حسبِ معمول مَیں نے پھر چیک اَپ کرایا، تو یہ جان کر بے حد حیرت و خوشی ہوئی کہ وہ تمام داغ جو میرے پچھلے ایکس ریز میں آئے تھے، نیست و نابود ہوگئے۔ آج اس کو پچیس سال ہو چکے ہیں، لیکن اَب اُس موذی مرض سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ اِس کے ساتھ ہی ایک واقعہ اور سن لو.....! میرا ایک دوست، عامر ہے۔ بچپن میں ہم دونوں نے سگریٹ نہ پینے کے عہد کیے تھے۔ پھر وہ پاکستان چلا گیا۔ طویل مدّت بعد اُس کا خط آیا۔ اُس کی تحریر میں ایک جگہ جلے کا نشان تھا۔ اُس نشان پر سوالیہ نشان بنا کر مَیں نے وہی خط واپس کر دیا۔ اُس کے بعد جب مَیں پاکستان گیا، تو اس کی بیوی؛ ثریّا نے مجھ پر طنز کیا: ''یہ وہی سوالیہ نشان ہیں کیا ....؟'' اور مَیں، ''ہاں بھئی ہاں۔'' کہہ کر عامر سے چمٹ گیا۔ گفتگو کے دوران ثرّیا نے اچانک کہا: ''تم دونوں سگریٹ چھوڑتے کیوں نہیں .....؟''

''پہلے یہ چھوڑے۔'' مَیں نے عامر کی جانب اِشارہ کیا۔

''پہلے یہ۔'' عامر نے میری جانب انگلی اٹھائی۔ ثریّا بلا کی ذہین تھی۔ خلیل جبران اور ٹالسٹائی جیسے قلم کاروں پر گھنٹوں بحث کرنے والی، اُس کے دو بچّے تھے، ایک لڑکا، اور ایک لڑکی۔ لڑکا؛ ماں کی شباہت لیے تھا، اور لڑکی باپ کی۔

''میری کون سی تخلیق پسند ہے، تم کو....؟'' ثریّا نے دونوں بچّوں کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا، اور مَیں نے لڑکی کی جانب انگلی اٹھادی۔

''ہاں....! بھئی، تم کو اپنا دوست عزیز ہے نا....؟'' وہ مسکرائی۔

''اور تم کو....؟'' پھر ثریّا نے عامر سے یہی سوال کیا، اور عامر نے لڑکے کی جانب انگلی اٹھادی۔

''تجھ کو تو یہی پسند آئے گا، تیری لیلیٰ کی شباہت جو ہے، اِس میں۔'' مَیں نے عامر کے چٹکی لی۔

''تم کو اس کی قسم ہے۔'' ثریّا نے لڑکی کی جانب اِشارہ کر کے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''اور تم کو اِس کی۔'' پھر ثریّا نے لڑکے کی طرف اشارہ کر کے عامر کو مخاطب کیا، اور ہم دونوں پر برس پڑی: 'جب تم دونوں سگریٹ چھوڑ دینا، تب ہی ایک دوسرے کو خط لکھنا، ورنہ نہیں۔''

''اس روز مجھ کو پہلی بار اِحساس ہوا کہ عورت اپنے شوہر کی کس قدر ہم درد ہوتی ہے، اُس کے بعد

مَیں پاکستان سے چلا آیا، اور پھر تقریباً پندرہ سال گزر گئے، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خط نہ لکھا، برائے کرم آیندہ میری سگریٹ نوشی کو زیرِ بحث نہ لانا.....! کیوں کہ مجھے اپنے ماضی کے وہ ایّام یاد آجاتے ہیں جن کو مَیں فراموش کر چکا ہوں۔'' اُس نے تاکید کی۔

''یہ تو مَیں بھی مانتا ہوں، اگر آپ اُس وقت سگریٹ نہ پیتے تو غالباً مرجاتے، لیکن آپ کی دلیلوں کے درمیان میرے ذہن میں جو سوالات اُبھرے ہیں، اُن کے جوابات جاننا چاہتا ہوں۔'' چوں کہ مجھ کو اُس کی جان بچانی تھی لہٰذا مَیں نے مودبانہ اَنداز میں کہا۔

''کیا تمھارے سوالات میری سگریٹ نوشی سے متعلق ہیں.....؟'' اُس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''ہاں۔'' اور میرے لہجے میں کپکپاہٹ۔

''لیکن مَیں جواب دینے کے موڈ میں نہیں۔'' اُس نے صاف انکار کیا، اور مَیں سوچنے لگا کہ کوکبی و مہتابی کی سرشت رکھنے والا وہ اِنسان، جس نے سمندر کے سینے چیر کر بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑائے ہوں، کیا کبھی تمبا کو بھرے ذرا سے کاغذ کے بے جان ٹکڑے کا تابع ہوسکتا ہے.....؟، اور یہ بھی عجیب شخص ہے کچھ سننے کو تیار ہی نہیں، کم بخت.....! موت کو دعوت دیے جارہا ہے، لذّت کی للک میں۔ مَیں تو سگریٹ چھڑادوں، لیکن میری سنے تب نا.....؟، ورنہ اُن وکیل صاحب سے زیادہ ذہین نہیں، جنھوں نے میری بات سن کر اپنی بیس سال کی طلب کو نظر اَنداز کر کے اپنی سگریٹ کی ڈبّی توڑ پھینکی تھی، اور پھر کبھی سگریٹ کو ہاتھ نہ لگایا۔ اور نہ اُن گھورا دادا سے زیادہ جاہل، جنھوں نے میری دلیل سن کر بیڑی کا بنڈل توڑ پھینکا تھا، اور پھر کبھی بیڑی نہ پی۔

اَبھی اُس روز شہر کے معروف شاعر رونق مصوّر کی مردانگی پر چوٹ کی، تو اُنھوں نے بھی کئی معتبر شعرا کے روبہ رو سگریٹ نہ پینے کا عہد نامہ لکھ دیا۔، جس کو عرصہ ہوگیا، وہ آج تک اپنے عہد پر قائم ہیں۔ سگریٹ تو یہ بھی چھوڑیں گے حضرت، لیکن کچھ کرنا پڑے گا۔

کئی ماہ بعد جب اُس کے یہاں پہنچا، تو اُس کے ہاتھ میں سگریٹ تھی اور کمرا دُھویں سے بھرا تھا۔ مجھے بیٹھنے کا اِشارہ کر کے وہ دھویں کے مرغولے اُڑاتا رہا۔

''تمھاری بھابی تو ہیں نہیں، چاے خود ہی بنا کر لاتا ہوں، تمھارے لیے۔'' جب وہ سگریٹ ختم کر کے اندر چلا گیا، تو مَیں نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا۔ میز پر ثریا کا ایک لفافہ تھا، مَیں نے جلدی سے اُسے کھول لیا، جس کے جملے کچھ اِس طرح تھے: ''کس قدر سلفش ہو تم دونوں.....؟ جو ایک بے جان کاغذ کے ٹکڑے کے درمیان بھرے زہر کے تابع ہو کر ایک دوسرے کی جان لینے پر تُلے ہو۔ جب تم دونوں کو اپنی پروا نہیں، تو اولاد کی کیا ہوگی۔ پھر بھی لکھے دیتی ہوں: ''میرے دونوں پھول ٹی۔ بی. کا بھرپور شکار ہو چکے ہیں۔'' اِتنے میں اُس کے آنے کی آہٹ ہوئی اور مَیں نے لفافہ جیوں کا تیوں رکھ دیا۔ اُس نے کمرے میں آکر چاے پیش کی، اور خود سگریٹ سلگالی۔ ثریا کی تحریر پر بات کرنا تو قیامت تھی، کیوں کہ بِنا اجازت تحریر پڑھ لینے کا جرم جو عائد ہوتا تھا، مجھ پر۔ مَیں نے جیسے تیسے چاے چڑھائی اور نکل آیا۔

ایک ہفتہ بعد پھر پہنچا تو اُس کی لڑکی کی کھانسی نے میرے ذہن میں آگ لگا دی، اور وہ سمجھ گیا، بولا: ''سردی کافی پڑنے لگی ہے، میرا ہی خون ہے، نا....؟'' وراثت میں کچھ تو پائے گی ہی۔ پھر اُس نے میرے ہاتھ سے میرا افسانہ برائے اصلاح لے کر رکھ لیا۔

اُس کو سگریٹ کے متعلق تحریر کے ذریعے اپنی بات سمجھانے کا خیال تب آیا، جب مَیں رات کے دس بجے حسبِ معمول باتھ روم میں اپنے جسم پر پانی ڈال چکا تھا۔

لکھنے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ وہ وقت نکل جائے تو تحریر میں پھر وہ بات نہیں آتی۔ لہٰذا پلاٹ ذہن میں آتے ہی جسم پر تولیا لپیٹ کر فوراً باہر آیا، اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا۔

''یہ سچ ہے کہ سگریٹ سِلو پائزن ہے، یعنی کہ انسان کی موت۔ سگریٹ نے جن حالات کے تحت آپ کو زندگی دی، اُس سے آپ ناواقف ہیں۔ یہ تو آپ نے خود ہی تسلیم کیا ہے، کہ اپنی ماں سے وراثت میں ملا نزلہ، آپ میں کچھ زیادہ ہی تھا۔ دراصل ٹھنڈ پا کر جمے خون کے انفکشن کو نزلہ کہتے ہیں۔ یعنی کہ ٹھنڈ پا کر خاص طور سے دماغ اور پھیپڑوں کی نسوں میں خون، کف کی شکل میں جم کر سڑنے لگتا ہے، اور یہی جما ہوا کف آپ کے ایکس۔رے۔ میں داغ کی شکل میں دکھائی دیا تھا۔ جس کے مطابق ڈاکٹرز نے آپ کو ٹی۔بی کا مریض سمجھ کر علاج کیا۔''

رات کا ایک بج رہا ہے۔ دسمبر کی سردی میرے کُھلے جسم پر پوری طرح اثر کر چکی ہے۔ میرے پھیپڑوں میں خون جم کر اُن کے پھولنے اور سکڑنے میں دِقّت اور تکلیف پیدا کرنے لگا ہے۔ اگر کپڑے پہنّے کا اِرادہ کروں تو پلاٹ ذہن سے واش ہو جانے کا امکان ہے۔

''آؤ....! اَب یہ سمجھ لو کہ سگریٹ آپ کو موت کے قریب کس طرح لیے جا رہی ہے؟ یہ تو آپ نے مان ہی لیا ہوگا کہ سگریٹ کے دھویں نے آپ کے پھیپڑوں کے کف کو سڑا کر باہر کر دیا۔ تو اَب آپ یہ بھی سمجھ لیں کہ وہ دھویں کی پرت اَب آپ کے پھیپڑوں کی اَندرونی پرت پر اپنا اثر ڈال کر اُس کو مزید سڑاتی جا رہی ہے، اور پھیپڑے دن بہ دن کم زور ہوتے جا رہے ہیں۔ اُس کے بعد نسیں سڑ کر اُن سے خون رسنے لگے گا، جو موت کے مُنہ میں دھکیل دے گا۔''

میرا دم نکلنے والا ہے۔ مرتے مرتے مَیں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں: ''آج کے ترقّی یافتہ دور میں کیا سگریٹ ہی آپ کے پھیپڑوں میں جمے کف کو باہر کرنے میں کامیاب ہے، اور کوئی دوا نہیں.....؟''

اَب میرے پھیپڑوں نے کام کرنا بند کر دیا ہے، میرا جسم ٹھنڈا ہو چکا ہے، یعنی کہ مَیں مر چکا ہوں۔

مجھے خوشی ہے کہ میرے مرنے کے بعد پولِس نے میری تحریر کو اخبارات میں شائع کرا دیا۔ بہت سے لوگوں کی طرح آپ نے بھی میری تحریر پڑھ کر سگریٹ کی ڈبی مَسل کر پھینک دی، اور مَیں سگریٹ چھوڑنے والی اُن عظیم ہستیوں کے وجود میں سما گیا جن کو آپ کی طرح دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔

☆☆☆

انجم شافعی
حیدرآباد

غزلیں

شہرِ سخن میں پیکرِ حسن صفا بھی ہو
جانِ غزل ہو اور صنم آشنا بھی ہو
ہمدم، وفا شعار ہو وہ دلربا بھی ہو
غمخوار و غمگسار بھی ہو وہ ہمنوا بھی ہو
وہ شوخ گلبدن ہو، ذرا باحیا بھی ہو
مستِ شباب، ماہ جبیں، مہ لقا بھی ہو
زلفوں سے اس کی کھیتی اُلھڑ صبا بھی ہو
عارض پہ اس کے حسن کی روشن ضیاء بھی ہو
چشمان سرگیں میں ناز و ادا بھی ہو
ہونٹوں پہ ابتسام کا اک سلسلہ بھی ہو
باتوں سے اس کی صاف محبت کا ہو ظہور
اظہارِ عشق کا اسے کچھ تجربہ بھی ہو
تاہم حسین کو ئی نہیں تجھ سا ہو صنم
ناہید، مشتری ہو کہ اختر سہا بھی ہو
اس کو شرابِ غم کے بھی پینے کا ہو شعور
میکش کے دست قلب میں جام انا بھی ہو
انجم شناس ہو تو ہو ہمدرد و ہم نشیں
شیریں کلام ہو وہ با اعتناء بھی ہو
ان ساری خواہشات کا مقصد یہ ہے صنم
انجم کا جو صنم ہو وہ انجم نما بھی ہو

oOo

آج آسودگی ہوگئی سنگلاخ
اس سبب سے ہوئی زندگی سنگلاخ
فطرتِ حسن کی شستگی سنگلاخ
دلبری بے وفا، عاشقی سنگلاخ
ہوگئی حق سے جب آگہی سنگلاخ
آدمی پر ہوئی بندگی سنگلاخ
نسلِ نو میں سمائی فرنگی وَبا
نسلِ نو کی ہے اب تازگی سنگلاخ
جب تصنّع پہ انسان راغب ہوا
خود بخود ہوگئی سادگی سنگلاخ
اس قدر آدمی ہوگیا خود غرض
دوستوں کی ہوئی دوستی سنگلاخ
آج ہر عیب ہے مثلِ فنّ و ہنر
اب ہنر کی بنی دل کشی سنگلاخ
بربریت کا جب سے یہاں راج ہے
راہِ انسانیت ہوگئی سنگلاخ
پائے گا کیسے کوئی یہاں منزلیں
ہوگئی ہو جہاں رہبری سنگلاخ
آج انجم تعصب کا ہے یہ اثر
ساز بے کیف ہے نغمگی سنگلاخ
جدّتوں کا اب انجم تماشہ ہے یہ
اب ہے بنجر غزل شاعری سنگلاخ

oOo

محمد انیس فاروقی انیسؔ
9-4-61/82، نورِ جبین
معراج کالونی، ٹولی چوکی
حیدرآباد 008 500 (تلنگانہ)

نظمیں

سزا

اشک ہیں میرے غم کی زباں
تم سمجھنا چاہو سمجھ سکتی ہو
سفرِ زندگانی کا مرا
کیسے کٹا
وقت کی گرد
وجود کے پیراہن پر جمی رہی
اُداس لمحوں کا کرب
تہہ در تہہ
چھایا رہا چہرے پر
یہی سوچ کے کیا تھا ہجرت
کہ ہجرت میں ہو شاید برکت
لیکن،
کل جو پھیلی تھی شِکن
زیست کی جبیں پر آج بھی ہے
اُداس لمحوں کا کرب پھیلا ہوا
چہرے پر آج بھی ہے
تم سے بچھڑنے پر
شاید یہی سزا ہے میری!

oOo

شکستِ خواب

رات ہے تنہائی ہے
اور میں ہوں
نیند آنکھوں میں جھلملاتی ہے
اور
نیند سے بوجھل پلکیں
بند ہوتی ہیں
کھلتی جاتی ہیں
دفعتاً یاد اُن کی
ٹوٹے آئینے
کرچیاں اُن کی
صحنِ دل میں
بکھر سی جاتی ہیں
اور بے خواب میری آنکھوں میں
خواب بن بنکے جھلملاتے ہیں
تُم جو رُوٹھے تو میں منا بھی لوں
نیند کیوں مجھ سے رُوٹھ جاتی ہے

oOo

محمد ہارون سیٹھ سلیم
2/3، اِسپنسر روڈ
فریزر ٹاؤن، بنگلور 005 560 (کرناٹک)

غزلیں

خلوت کدے میں ہم کو بلایا نہیں گیا
چہرہ عروسِ نو کا دکھایا نہیں گیا
آنچل کو اُ سکے رُخ سے ہٹایا نہیں گیا
پردہ اُٹھا ہوا تھا گِرایا نہیں گیا
افسوس جشنِ شادی منایا نہیں گیا
دُلہن کی سیج کو بھی سجایا نہیں گیا
اِک بار اُن کی شکل ہمیں دیکھنے کے بعد
نظروں میں اور کوئی سمایا نہیں گیا
وہ جس کو اپنے دل میں بسانے کی چاہ تھی
مجبوریاں تھیں دل میں بسایا نہیں گیا
مایوس کُن تھی محفل رقص و سُرود کی
بزم طرب میں ناچ نچایا نہیں گیا
پیاسے کھڑے ہوئے تھے وہاں میرے ہم نشین
شربت کا ایک گھونٹ پلایا نہیں گیا
رحمت خدا کی ہوتے ہیں مہمان دوستو
عظمت کے ساتھ اُن کو بٹھایا نہیں گیا
اِک واقعہ کہوں یا اِسے حادثہ کہوں
وہ جس کو تاحیات بُھلایا نہیں گیا
سمجھا تھا میں نے جن کو کبھی اپنا رازداں
اُن سے بھی میرا راز چُھپایا نہیں گیا
آئے تھے وہ جو کرنے عیادت سلیم کی
اپنے چلے گئے تھے پرایا نہیں گیا

oOo

ہاتھوں میں لئے تیغ و تبر ایک لاکھ میں
بندہ کھڑا ہوا ہے سینہ سپر ایک لاکھ میں
بیچوں گا اپنا قلب و جگر ایک لاکھ میں
ہے کوئی لینے والا اگر ایک لاکھ میں
آنے لگے ہیں لوگ یہاں دُور دُور سے
اخبار نے یہ چھاپی خبر ایک لاکھ میں
وہ چاہتے ہیں سارا گلستاں خریدلیں
غنچوں سمیت برگ و شجر ایک لاکھ میں
انساں کا بس چلے تو خریدے گا ایک دِن
اَرض و سماء یہ شمس و قمر ایک لاکھ میں
اِنسان کو جُنوں ہے خرید و فروخت کا
باغِ جِناں میں ہے کوئی گھر ایک لاکھ میں
حُور و مَلَک بھی سوچ رہے ہوں گے خُلد میں
کہ ہوگا کوئی نیک بشر ایک لاکھ میں
یارو کسی کا گھر ہے تمہیں توڑنا اگر
کرکے رہیں گے زیر و زبر ایک لاکھ میں
تیرے گلے کا ہار بنانے کی چاہ میں
لائے ہیں میں نے لعل و گہر ایک لاکھ میں
ساقی مجھے پلا نہ سکا میں نہ پی سکا
پیرِ مغاں نے لالی خمر ایک لاکھ میں
قارون کا خزانہ ہمیں چاہیے سلیم
مُشکل ہے زندگی کا سفر ایک لاکھ میں

oOo

ڈاکٹر صبیحہ نسرین قادری شمسی
حیدرآباد

غزلیں

سوچا تھا تجھے ہم اپنا بنالیں گے
ساری زندگی ہنس ہنس کے بِتالیں گے
ساری خوشیاں دامن میں ترے بھر کر
تونے دیئے ہیں جو درد چھپالیں گے
جنت کو جہنم تو نے بنا ڈالا
کیسے ہم غموں میں عید منالیں گے
اُلفت میں تری جب ڈوب ہی گئے ہیں ہم
دامن پر لگے سب داغ مٹالیں گے
کر کر کے عبادت رب کو منالیں گے
تجھ کو غموں سے شمسی چھڑالیں گے

oOo

جھوٹ سے توبہ کرلو ساجن
کشتی ڈوبی بچالو ساجن
سچ میں جیت تیری پکّی
صرف ہمت جُٹالو ساجن
وقت جب بھی ملے گر تجھ کو
ایک نیکی کمالو ساجن
بات میری بہت کڑوی ہے
پھر بھی ہنس کر بچالو ساجن
شمسی کو جان اب تو بھی
اپنی جنّت بچالو ساجن

oOo

جہانگیر قیاسؔ
حیدرآباد

غزلیں

مال و زر اور نہ ہی دولت کو دَبا رکھتے ہیں
کچھ نہیں رکھتے مگر پاسِ وفا رکھتے ہیں
مشغلے یوں تو زمانے میں بہت ہیں لیکن
مشغلہ اپنا انہیں یاد سدا رکھتے ہیں
جانے آجائیں گے کب اپنے پرائے گھر کو
ہم بھی دروازے کو ہر وقت کُھلا رکھتے ہیں
روشنی سے ہمیں کچھ ہوگئی نفرت اِتنی
ہم سرِ شام چراغوں کو بجھا رکھتے ہیں
لاکھ نفرت کا سبق ہم کو زمانہ دے قیاسؔ
ہم مگر سینے میں چاہت کا دِیا رکھتے ہیں

oOo

مطلب نہیں ہے مجھ کو زمیں آسمان سے
مطلب ہے صرف مجھ کو مرے مہربان سے
مجھ کو یقیں ہے جانا تو اک دن ہے لازمی
جانا پڑے تو جاؤں گا اک دن میں جان سے
دولت کی ہم کو چاشنی ہرگز نہیں رہی
غربت میں ہم ضرور ہیں جیتے ہیں شان سے
رشتوں سے آج تک نہیں بھٹکا یہ ناز ہے
مل کر ہمیشہ رہتا ہوں میں خاندان سے
نفرت برائی سے مجھے ہر دم رہی قیاسؔ
سچائی بس اُگلتا ہوں اپنی زبان سے

oOo